ISSN: 2321-8339

اپریل - جون ۲۰۲۳ء

مؤسس: مولانا سید جلال الدین عمریؒ

ادارہ تحقیق وتصنیفِ اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی

# تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

مدیر

محمد رضی الاسلام ندوی

# اہم مطبوعات

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی کی

| | | |
|---|---|---|
| معرکۂ اسلام وجاہلیت | مولانا صدرالدین اصلاحی | 110.00 |
| اسلام۔ایک نجات دہندہ تحریک | مولانا سلطان احمد اصلاحی | 90.00 |
| عصر حاضر کا سماجی انتشار اور اسلام کی رہ نمائی | مولانا سلطان احمد اصلاحی | 125.00 |
| عصر حاضر کی نفسیاتی الجھنیں اور ان کا اسلامی حل | مولانا سلطان احمد اصلاحی | 80.00 |
| اکیسویں صدی کے سماجی مسائل اور اسلام | ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی | 140.00 |
| قرآن، اہل کتاب اور مسلمان | ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی | 70.00 |
| گھریلو تشدد اور اسلام | ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی | 30.00 |
| حقائق، اسلام۔بعض اعتراضات کا جائزہ | ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی | 56.00 |
| حضرت ابراہیم۔امامِ انسانیت | ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی | 85.00 |
| ہم جنسیت کا فتنہ | ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی | 28.00 |
| احیائے اسلام: مفہوم۔مسایل، تقاضے | مولانا محمد جرجیس کریمی | 85.00 |
| جرائم اور اسلام | مولانا محمد جرجیس کریمی | 85.00 |
| قرآن مجید اور مستشرقین | مولانا محمد جرجیس کریمی | 72.00 |
| اتحادِ امت کا مسئلہ: چند اہم گوشے | مولانا محمد جرجیس کریمی | 34.00 |
| اسلام کی امتیازی خصوصیات | مولانا محمد جرجیس کریمی | 100.00 |
| سیرتِ نبوی پر اعتراضات کا جائزہ | ڈاکٹر محمد غیمیم اختر قاسمی | 130.00 |
| ملت اسلامیہ کے اختلافات | مولانا ضمیر الحسن فلاحی | 65.00 |
| قیامِ امن اور اسلام | مولانا کمال اختر قاسمی | 100.00 |

**ملنے کے پتے:**

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی
نبی نگر، پوسٹ بکس نمبر: ۹۳، علی گڑھ۔۲

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز
D-307، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی۔۲۵

ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی

# تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

اپریل ——— جون ۲۰۲۳ء

**مدیر**

محمد رضی الاسلام ندوی

**مجلس ادارت**

۱۔ مولانا محمد فاروق خاں، سابق صدر ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، علی گڑھ

۲۔ پروفیسر اشتیاق احمد ظلّی، سابق ناظم دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ

۳۔ پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی، ڈین فیکلٹی آف تھیالوجی، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ

۴۔ پروفیسر اسرار احمد خاں، شعبۂ تفسیر، انقرہ یونی ورسٹی (ترکی)

۵۔ ڈاکٹر محمد اکرم ندوی، ڈین کیمبرج اسلامک کالج (برطانیہ)

۶۔ مولانا اشہد جمال ندوی، سکریٹری ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی علی گڑھ

ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی

نبی نگر (جمال پور)، پوسٹ بکس نمبر ۹۳، علی گڑھ-۲۰۲۰۰۲

ISSN: 2321-8339

# سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ

جلد:۴۲ شمارہ:۲

رمضان ـــــــ ذی قعدہ ۱۴۴۴ھ

اپریل ـــــــ جون ۲۰۲۳ء

## زرِتعاون

**اندرونِ ملک**

| | |
|---|---|
| فی شمارہ | ۷۵/روپے |
| سالانہ | ۳۰۰/روپے |
| پانچ سال کے لیے | ۱۲۰۰/روپے |
| سالانہ (لائبریریاں واداارے) | ۴۰۰/روپے |

**بیرونِ ملک**

| | |
|---|---|
| سالانہ (انفرادی) | ۱۰۰۰/روپے |
| سالانہ (ادارے) | ۱۵۰۰/روپے |

**ایجنسی کمیشن**

| | |
|---|---|
| ۵ سے ۲۰ کاپیوں تک | 25% |
| ۲۰ سے زائد کاپیوں پر | 30% |

ڈاک خرچ بذمہ ادارہ

**ویب سائٹ**
www.tahqeeqat.net

برائے ادارتی امور

**ای میل:**
tahqeeqat@gmail.com
mrnadvi@gmail.com

**موبائل/واٹس ایپ:**
+91-9582050234

برائے انتظامی امور

**ای میل:**
idaratahqeeq2016@gmail.com

**موبائل/واٹس ایپ:**
+91-9897746586
+91-7786808467

**اکاؤنٹ:**
Tahqeeqat-e-Islami,
Union Bank of India
Muslim University, Branch
**A/C.No.** 452201010029001,
**IFSC:** UBIN0545228

طابع وناشر اشہد جمال ندوی نے بھارت آفسیٹ، نئی دہلی سے چھپوا کر
ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، نبی نگر (جمال پور)، علی گڑھ سے شائع کیا۔

# فہرست مضامین


## حرف آغاز

کم سنی کی شادی۔ اسلام کا نقطۂ نظر — محمد رضی الاسلام ندوی — ۵

## مطالعۂ مذاہب

یہودی الٰہیات کا تنقیدی جائزہ — حافظ محمد احسن رضا — ۲۱

## فقہیات

شرکتِ محدودہ (لمیٹیڈ کمپنی) کی شرعی حیثیت — مولانا اختر امام عادل قاسمی — ۳۵

## اقتصادیات

کسبِ معاش اور اسلام — مولانا محمد انس فلاحی مدنی — ۶۱

## مطالعۂ کتب

تفسیروں میں اسرائیلی روایات — پروفیسر ابوسفیان اصلاحی — ۸۵

## تعارف وتبصرہ

The Foreign vocabulary of the Qur'an — محمد رضی الاسلام ندوی — ۱۱۱

مسلم علماء کا مطالعۂ ہندوستان — مولانا محمد جرجیس کریمی — ۱۱۵

**خبرنامہ ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی** (۸۷) — ادارہ — ۱۱۷

مضامین کا انگریزی خلاصہ — ۱۲۱ – ۱۲۸

# اس شمارے کے لکھنے والے


۱- حافظ محمد احسن رضا

اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ علوم اسلامیہ، جی سی یونی ورسٹی (فیصل آباد)
ahsan.raza62@yahoo.com

۲- مولانا اختر امام عادل قاسمی

جامعہ ربّانی منورواشریف، بہار
jamia.rabani@gmail.com

۳- مولانا محمد انس فلاحی مدنی

رکن ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ
anasfalahi@gmail.com

۴- پروفیسر ابوسفیان اصلاحی

پروفیسر شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ
isislahi@gmail.com

۵- مولانا محمد جرجیس کریمی

رکن ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، علی گڑھ
jarjeeskarimi@gmail.com

۶- محمد رضی الاسلام ندوی

صدر ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ
mrnadvi@gmail.com

## حرفِ آغاز

# کم سنی کی شادی۔ اسلام کا نقطۂ نظر

______________ محمد رضی الاسلام ندوی

ہندوستانی پارلیمنٹ میں ۲۰۲۱ء کے اواخر میں The Prohibition of Child Marriage (Amendment) Bill 2021 پیش کیا گیا، جس میں لڑکیوں کے لیے شادی کی کم از کم عمر اکیس (۲۱) برس قرار دی گئی ہے۔ یہ بل ایوانِ زیریں (Lok Sabha) میں منظور ہو چکا ہے، ابھی ایوانِ بالا (Rajya sabha) سے اس کی منظوری باقی ہے۔ دونوں ایوانوں سے منظوری کے بعد ہی وہ قانون (Act) کی شکل اختیار کر سکے گا۔

گزشتہ ایک صدی میں ہندوستان میں لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے شادی کی کم از کم عمر کے سلسلے میں مختلف قوانین بنائے گئے ہیں۔ برٹش انڈیا میں ۱۹۲۹ء میں Child Marriage Restraint Act منظور کیا گیا تھا، جس میں شادی کے لیے کم از کم عمر لڑکے کی اٹھارہ (۱۸) برس اور لڑکی کی چودہ (۱۴) برس قرار دی گئی تھی۔ ملک کی آزادی کے بعد ۱۹۴۹ء میں Sarda Act منظور کیا گیا، جس میں شادی کے لیے لڑکے کی کم از کم عمر اٹھارہ (۱۸) برس باقی رکھی گئی، جب کہ لڑکی کی کم از کم عمر ایک برس کا اضافہ کرکے پندرہ (۱۵) برس کردی گئی۔ اس قانون میں ۱۹۷۸ء میں تبدیلی (Amendment) کی گئی اور شادی کے لیے لڑکے کی کم از کم عمر اکیس (۲۱) برس اور لڑکی کی کم از کم عمر اٹھارہ (۱۸) برس کردی گئی۔ ۲۰۰۶ء میں اسے The Prohibition of Child Marriage Act کا نام دیا گیا اور اس میں لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے شادی کی کم از کم عمر کی مذکورہ بالا حد باقی رکھی گئی۔ اب ۲۰۲۱ء میں پیش کیے گئے بل کے ذریعہ لڑکوں کی طرح لڑکیوں کے لیے بھی

شادی کی کم از کم عمر اکیس (۲۱) برس کر دیے جانے کی تجویز ہے۔

شادی کی کم از کم عمر میں اضافہ کی تجویز پیش کرنے والوں کا خیال ہے کہ اس سے قبل لڑکوں اور لڑکیوں میں جسمانی اور نفسیاتی پختگی نہیں آتی۔ بلوغت کے بعد بھی اعضائے جسم میں نشو ونما ہوتا رہتا ہے۔لڑکے اس وقت تک خود کفیل نہیں ہو پاتے ،اس بنا پر خاندان کو چلانے پر قادر نہیں ہوتے۔لڑکیاں جنسی تعلق کے بعد حمل سے ہوجاتی ہیں، جس کے لیے ان کا جسم پوری طرح تیار نہیں ہوتا اور اگر وہ ابھی بالغ نہ ہوئی ہوں تو ان کی صحت پر مزید بُرے اثرات پڑتے ہیں۔

## مسلمانوں میں کم سنی کی شادی کا رجحان۔ایک مفروضہ

اب تک ملک میں کم سنی کی شادی پر پابندی کا جو قانون نافذ ہے، اس کی رؤ سے اکیس (۲۱) برس سے کم عمر میں لڑکے کی اور اٹھارہ (۱۸) برس سے کم عمر میں لڑکی کی شادی کرنا قابلِ تعزیر جرم ہے۔اس قانون کا سہارا لے کر ملک کی شمال مشرقی ریاست آسام میں سالِ رواں کے اوائل میں پولیس نے ایسے ہزاروں مردوں اور ان کے رشتے داروں کو گرفتار کرلیا جنھوں نے گزشتہ برسوں میں اٹھارہ (۱۸) برس سے کم عمر کی لڑکیوں سے شادی کی تھی۔جن لوگوں کو گرفتار کیا گیا ان میں زیادہ تر مسلمان ہیں۔اگرچہ ریاست کے وزیر اعلیٰ (ہیمنت بسواشرما) نے وضاحتی بیان جاری کیا، جس میں کہا ہے: ''یہ ایک غیر جانب دار اور سیکولر ایکشن ہے۔اس میں کسی مخصوص برادری کو نشانہ نہیں بنایا گیا ہے۔'' لیکن گرفتار شدگان میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہونے کے سبب یہ تاثر عام ہوا ہے کہ کم سنی کی شادی کا رجحان دیگر اہلِ مذاہب کے مقابلے میں مسلمانوں میں زیادہ ہے۔حکومت اور حکم راں جماعت (بھارتیہ جنتا پارٹی) نے جان بوجھ کر یہ پروپیگنڈا کیا ہے کہ اس غیر قانونی عمل کا ارتکاب کرنے والے زیادہ تر مسلمان ہیں۔حالاں کہ یہ سراسر مفروضہ ہے۔اعداد وشمار اس کی تائید نہیں کرتے ، بلکہ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ کم سنی کی شادی کے رجحان کا بنیادی سبب مذہب نہیں، بلکہ غربت اور تعلیم کی کمی ہے۔

ملک کی وزارتِ صحت وخاندانی فلاح وبہبود نے National Family and

Health Survey 2019-2021 جاری کیا ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ اس عرصہ میں ملک کی کل آبادی میں 17.7% مردوں (لڑکوں) کی شادی اکیس (۲۱) برس سے کم عمر میں اور 23% عورتوں (دلہنوں) کی شادی اٹھارہ (۱۸) برس سے کم عمر میں ہوئی ہے۔سروے میں تمام ریاستوں کے الگ الگ اعداد وشمار بھی پیش کیے گئے ہیں۔[۱] چند ریاستوں میں شادی کی کم از کم عمر سے پہلے شادی کرنے والوں کا تناسب درج ذیل ہے:

| نمبر شمار | ریاست | اکثریت مع تناسب | مرد حضرات (جنہوں نے شادی کی کم از کم عمر سے پہلے شادی کی) | خواتین (جنہوں نے شادی کی کم از کم عمر سے پہلے شادی کی) |
|---|---|---|---|---|
| ۱ | جموں وکشمیر | مسلم 68.31% | 8.5% | 4.5% |
| ۲ | لکش دیپ | مسلم 96.58% | 0% | 1.3% |
| ۳ | پنجاب | سکھ 57.69% | 11.4% | 8.7% |
| ۴ | میزورم | عیسائی 87.16% | 11% | 8% |
| ۵ | ناگالینڈ | عیسائی 87.93% | 5% | 5.6% |
| ۶ | مغربی بنگال | ہندو 82.69% | 20% | 41.6% |
| ۷ | بہار | ہندو 70.54% | 30.5% | 40.8% |

اس تفصیل سے اس الزام کی قطعی طور پر تردید ہوجاتی ہے کہ کم عمری میں شادی کا رجحان مسلمانوں میں سب سے زیادہ ہے اور اس کا سبب مذہبی تعلیمات ہیں۔اگر یہ بات درست ہوتی تو جموں وکشمیر اور لکش دیپ میں، جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں، لڑکوں اور لڑکیوں میں کم عمری میں شادی کا تناسب زیادہ ہوتا، حالاں کہ وہاں یہ تناسب دیگر ریاستوں کے مقابلے میں بہت کم ہے۔

## قوانین کا تضاد

سماجی اصلاح اور عائلی زندگی کی بہتری کو پیش نظر رکھتے ہوئے حکومت ملک کے

شہریوں کے لیے قوانین بناسکتی ہے،لیکن ضروری ہے کہ ان قوانین میں ہم آہنگی پائی جائے، وہ ایک دوسرے کوتقویت پہنچانے والے ہوں اور ان سے مطلوبہ فائدے بہ خوبی حاصل کیے جاسکتے ہوں۔اگر کچھ مخصوص مقاصد کے لیے ایک قانون بنایاجائے،لیکن پہلے سے موجود دوسرا قانون ان مقاصد کی نفی کرتا ہوتو اس نئی قانون سازی کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

شادی کی کم از کم عمر بڑھانے کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں میں جسمانی اور نفسیاتی اعتبار سے پختگی آئے، خاص طور سے لڑکیاں جنسی تعلق کے عواقب کا سامنا کرنے کے لیے پوری طرح تیار ہوں، ان کے جنسی اعضاء کم عمری میں عملِ مجامعت (Intercourse) اورحمل کا باراٹھانے کے لیے پوری طرح تیار نہیں ہوتے ،اس لیے شادی کی کم ازکم عمر بڑھانا ضروری ہے۔دوسری طرف بلوغت کے بعد بغیر شادی کے جنسی تعلق میں کوئی حرج نہیں سمجھا گیا اور قانونی طور پر اس کی اجازت دی گئی۔۲۰۱۸ء میں سپریم کورٹ نے انڈین پینل کوڈ ۱۸۶۰ کی دفعہ ۳۷۷ کی روشنی میں کہا تھا کہ بالغ لڑکے اورلڑکی کی مرضی سے کیا جانے جنسی تعلق (Sextual relation) دستور کی دفعات:۱۴،۱۵،۱۹ اور ۲۱ کی روشنی میں بنیادی حقوق (Fundamental Rights) سے تعلق رکھتا ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ کم عمری میں بلوغت کے بعد بغیر شادی کے جنسی تعلق تو قانونی اور جائز ہے،لیکن اگر شادی کرکے جنسی تعلق قائم کیا جائے تو وہ غیر قانونی اور قابلِ تعزیر جرم ہوگا۔

## شادی کی کم ازکم عمر میں اضافہ،جنسی انارکی کا سبب

جنس(Sex) کا جذبہ ہرانسان میں فطری طور پر ودیعت کیا گیا ہے۔بلوغت کے ساتھ ہارمونس(Hormones) سے ایسے افرازات(Secretions) ہونے لگتے ہیں جن کے نتیجے میں ہرنوجوان لڑکا یا لڑکی صنفِ مخالف کی طرف کشش محسوس کرتی ہے۔ جنسی جذبہ اتنا شدید ہوتا ہے کہ اگر بروقت یا جلد اس کی تسکین کا سامان مہیّا نہ کیا جائے تو جسم پر اس کے بُرے اثرات مرتّب ہوتے ہیں اور آدمی جائز، ناجائز کی پروا کیے بغیر ہرممکن طریقے سے اس کی تسکین کی کوشش کرتا ہے۔اس کی مثال اس موج زَن دریا کی سی ہے

جس پر بند باندھنا ممکن نہیں ہوتا، وہ کہیں نہ کہیں سے اپنا راستہ نکال لیتا ہے۔

شادی کی کم از کم عمر میں اضافہ کرکے جنسی جذبہ کو قابو میں نہیں کیا جاسکتا۔اس سے یہ تو ہوسکتا ہے کہ لوگ سزا کے ڈر سے متعین حد سے پہلے شادی نہ کریں، لیکن اس کا لازمی نتیجہ یہ ظاہر ہوگا کہ بغیر شادی کے جنسی تعلقات میں اضافہ ہوگا۔سماج میں بے حیائی، آوارگی اور بدکاری عام ہوگی اور اخلاقیات کا جنازہ نکل جائے گا اور اس کا بھی قوی امکان ہے کہ رسوم و روایات کی جڑیں گہرائی میں پیوست ہونے کی وجہ سے انسانوں کا بڑا طبقہ قانون کو تسلیم نہ کرے اور اسے توڑنے میں اسے کوئی باک نہ ہو۔اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ مارچ ۲۰۲۰ء میں Ministry of Women and Child Development کے وزیر نے ایک سوال کے جواب میں لوک سبھا کو مطلع کیا تھا کہ سماجی رسوم وروایات پر عمل آوری، جہالت، غربت، سماج میں عورتوں کی ناقدری اور بیداری میں کمی کی وجہ سے بڑے پیمانے پر بچوں کی شادیاں کی جارہی ہیں۔ [۲]

## اسلام کا نظریۂ جنس

اسلام انسانوں کی فطرت میں ودیعت شدہ جذبۂ جنس کو تسلیم کرتا ہے۔اس معاملہ میں اس کا رویہ افراط اور تفریط کے درمیان اعتدال کا ہے۔وہ نہ تو کھلی چھوٹ دیتا ہے کہ لوگ جس طرح چاہیں اپنے جنسی جذبہ کی تسکین کرلیں اور نہ اسے دبانے اور کچلنے کا قائل ہے۔اللہ کے رسول ﷺ کو آپ کے متعدد اصحاب کے بارے میں خبر دی گئی کہ وہ شادی شدہ ہونے کے باوجود بیویوں سے لاتعلق رہتے ہیں۔آپؐ نے انہیں بلاکر تنبیہ کی کہ یہ میرا پسندیدہ طریقہ نہیں ہے۔اسلام میں رہبانیت کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔آپؐ نے فرمایا:

أَمَا وَاللّٰهِ إنِّی لَأَخشَاكُم لِلّٰهِ وَأَتقَاكُم لَهُ ، لٰكِنِّی أَصُومُ وَأُفطِرُ،وَأُصَلِّی وَأَرقُدُ وَأَتَزَوَّجُ النِّسَاءِ، فَمَن رَغِبَ عَن سُنَّتِی فَلَيسَ مِنِّی۔ [۳]

’’اللہ کی قسم، میں تم میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور سب

سے زیادہ تقویٰ اختیار کرنے والا ہوں، لیکن میں کبھی روزہ رکھتا ہوں اور کبھی نہیں رکھتا، کبھی نماز پڑھتا ہوں اور کبھی سوتا ہوں اور میں عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ جس نے میری سنت سے اعراض کیا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔''

اسلام نے جذبۂ جنس کی تسکین کے لیے صرف نکاح کو لازم کیا ہے۔ اس کے نزدیک بغیر نکاح کے جنسی تعلق بہت بڑا جرم ہے، جو عبرت ناک سزا کا مستحق ہے۔

## اسلام میں نکاح کے مقاصد

اسلام میں نکاح کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ اسے سماجی ضرورت کے ساتھ دینی عمل بھی قرار دیا گیا ہے۔ اسے انسان کا فطری داعیہ اور اللہ کے پیغمبروں کی سنت کہا گیا ہے۔ اس کے درج ذیل مقاصد بیان کیے گئے ہیں:

### الف: نسلِ انسانی کا تسلسل

اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ ہے کہ روئے زمین پر قیامت تک نوع انسانی کا وجود باقی رہے۔ اس کے لیے اس نے نکاح کی سنت کو جاری کیا ہے، تاکہ ہر زمانے میں لوگ رشتۂ ازدواج سے جڑیں اور بیٹوں اور پوتوں کا سلسلہ چلے۔ اس طرح پوری دنیا میں انسان مردوں اور عورتوں کی شکل میں پھیل جائیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُواْ رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالاً كَثِيْراً وَنِسَاء ۔(النساء:۱)

''لوگو! اپنے رب سے ڈرو، جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیے۔''

### ب۔ پُرسکون زندگی

اسلام چاہتا ہے کہ ازدواجی تعلقات الفت و محبت پر استوار ہو، زوجین ایک دوسرے کا خیال رکھیں، ایک دوسرے کی ضروریات پوری کریں اور مل جل کر اولاد کی

پرورش اور تربیت کریں۔اس طرح ان کی زندگی خوشی ومسرت اور اطمینان وسکون کے ساتھ گزرے۔اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

وَمِنْ آيٰتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجاً لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً (الروم:۲۱)

''اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے جوڑے بنائے، تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کردی۔''

### ج۔عفت وعصمت کی حفاظت

اسلام بے حیائی اور بدکاری کو سخت ناپسند کرتا ہے اور عفت وعصمت کی زندگی گزارنے کی تاکید کرتا ہے۔اسی لیے اس نے مردوں اور عورتوں دونوں کو حکم دیا ہے کہ نکاح کے بندھن میں بندھ جائیں،بغیر نکاح علانیہ جنسی تعلقات رکھیں نہ خفیہ آشنائیاں کریں۔قرآن مجید میں مردوں اور عورتوں دونوں کے بارے میں کہا گیا ہے:

مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلاَ مُتَّخِذِيْٓ أَخْدَانٍ (المائدۃ:۵)

''بہ شرطے کہ تم نکاح میں ان کے محافظ ہو، نہ یہ کہ آزاد شہوت رانی کرنے لگو یا چوری چھپے آشنائیاں کرو۔''

مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَلاَ مُتَّخِذٰتِ أَخْدَان (النساء:۲۵)

''تاکہ وہ حصارِ نکاح میں محفوظ ہوکر رہیں۔آزاد شہوت رانی نہ کرتی پھریں اور نہ چوری چھپے آشنائیاں کریں۔''

عربی زبان میں 'حصن' قلعہ کو کہتے ہیں۔مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے اس لفظ کا استعمال کرکے قرآن نے یہ تصور پیش کیا ہے کہ نکاح کے ذریعہ زوجین خود کو شیطان کے حملوں سے محفوظ کرلیتے ہیں اور پاکیزہ زندگی گزارنا ان کے لیے آسان ہوجاتا ہے۔

## بالغ ہونے کے بعد جلد نکاح پسندیدہ ہے

جائز ذریعہ سے جنسی خواہش کی تسکین میں سہولت کے پیش نظر ہی اسلام نے

نکاح کو بہت آسان بنایا ہے۔اس کی تعلیم یہ ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کے بالغ ہونے کے بعد جلد ان کے نکاح کی فکر کی جائے۔اللہ کے رسول ﷺ نے نوجوانوں کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا ہے:

**يَا مَعشَرَ الشَّبَابِ! مَن استَطَاعَ مِنكُم البَاءَةَ فَليَتَزَوَّج،فَإِنَّهُ أغَضُّ لَلبَصَرِ وَأحصَنُ لِلفَرجِ** ۴

''اے نوجوانوں کے گروہ! تم میں سے جو نکاح کر سکتا ہو اسے ضرور کر لینا چاہیے۔اس لیے کہ یہ نگاہ کو پست رکھنے اور شرم گاہ کو محفوظ رکھنے کا زیادہ مؤثر ذریعہ ہے۔''

شباب بلوغت کے بعد کے مرحلے کو کہتے ہیں اور 'باءۃ' میں مصارفِ نکاح کی فراہمی کے ساتھ جنسی صلاحیت کی فراوانی بھی شامل ہے۔ ۵

اللہ کے رسول ﷺ نے لڑکیوں کے سرپرستوں کو بھی تاکید کی ہے کہ ان کے نکاح میں تاخیر نہ کریں، ورنہ اس سے سماج میں فساد، بے حیائی اور آوارگی پھیلنے کا قوی اندیشہ ہے۔آپؐ نے ارشاد فرمایا ہے:

**اِذَا خَطَبَ اِلَيكُم مَن تَرضَونَ دِينَهُ وَخُلُقَهُ فَزَوِّجُوهُ، اِن لَا تَفعَلُوهُ تَكُن فِي الاَرضِ فِتنَةٌ وَّفَسَادٌ عَرِيضٌ** ۶

''جب تمہارے پاس کوئی ایسا شخص پیغامِ نکاح دے جس کی دین داری اور اخلاق تم پسند کرتے ہو تو اس سے رشتہ کر دو۔اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو روئے زمین میں فتنہ اور بڑا فساد پھیل جائے گا۔''

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

**اليَتِيمَةُ تُستَأمَرُ فِي نَفسِهَا، فَإِن صَمَتَت فَهُوَ إِذنُهَا،وَإِن أبَت فَلَا جَوَازَ عَلَيهَا، يَعنِي إِذَا أدرَكَت فَرَدَّت۔** ۷

''لڑکی سے نکاح کے وقت اس کی اجازت لی جائے گی۔اگر وہ خاموش رہے تو اسے اس کی اجازت سمجھی جائے گی اور اگر وہ انکار کر دے تو زبردستی اس کا نکاح کرنا جائز نہیں ہے۔یعنی اگر وہ بالغ ہو جانے کے

بعد نکاح کو رد کردے تو اسے اس کا اختیار ہے۔''

بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر لڑکا یا لڑکی کے بالغ ہونے کے بعد اس کا نکاح کرنے میں تاخیر کی گئی، جس کی بنا پر اس سے گناہ کا صدور ہوگیا تو اس کا وبال اس کے باپ/سرپرست پر ہوگا۔اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

مَن وُلِدَ لَهُ وَلَدٌ فَليُحسِن اسمَهُ وَأدَبَهُ، فَإذَا بَلَغَ فَليُزَوِّجهُ، فَإن بَلَغَ وَلَم يُزَوَّج فَأصَابَ اِثماً فَإنَّمَا اِثمُهُ عَلٰى أبِيهِ [۸]

''جس کے یہاں کوئی لڑکا (یا لڑکی) پیدا ہو، وہ اس کا اچھا سا نام رکھے اور اسے ادب سکھائے، پھر جب بالغ ہوجائے تو اس کا نکاح کردے۔ اگر وہ بالغ ہوجائے، لیکن اس کا نکاح نہ کرے، پھر اس سے کوئی گناہ سرزد ہوجائے تو اس کا وبال اس کے باپ پر ہوگا۔''

## کم سنی کے نکاح کا جواز

نکاح کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد توالد و تناسل ہے اور یہ بلوغت کے بعد ہی حاصل ہوسکتا ہے، اس لیے اسلام نے بلوغت کے بعد نکاح کو پسندیدہ قرار دیا ہے،لیکن اس نے مخصوص حالات میں بعض ناگزیر مصالح کے تحت بلوغت سے قبل بھی نکاح کی گنجائش رکھی ہے۔مثال کے طور پر لڑکی کے باپ کا انتقال ہوجائے اور کوئی اس کی کفالت کرنے والا نہ ہو۔اس طرح کی اور صورتیں بھی ہوسکتی ہیں۔قرآن مجید میں ہے:

وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتٰمَى فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنَى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۔ (النساء:۳)

''اور اگر تم یتیموں کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرتے ہو تو جو عورتیں تم کو پسند آئیں ان میں سے دو دو، تین تین، چار چار سے نکاح کرلو۔''

اس آیت کی ایک تفسیر، جو ام المومنین حضرت عائشہؓ سے مروی ہے، یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں جو یتیم بچیاں لوگوں کی سرپرستی میں ہوتی تھیں ان کے مال اور حسن و جمال کی وجہ سے، یا اس خیال سے کہ ان کے حقوق کا کوئی محافظ تو ہے نہیں، ہم انہیں جس طرح چاہیں گے، دبا کر رکھیں گے، وہ ان کے ساتھ خود نکاح کرلیتے تھے،لیکن انہیں مہر

نہیں ادا کرتے تھے اور بعد میں بھی ان پر ظلم کیا کرتے تھے۔اس پر کہا گیا کہ اگر تم کو اندیشہ ہو کہ یتیم لڑکیوں کے ساتھ انصاف نہیں کرسکو گے تو ان سے نکاح نہ کرو اور دوسری عورتوں سے، جو تمہیں پسند آئیں، نکاح کرلو۔۹

اس آیت میں لفظ 'یتامیٰ' آیا ہے، جس کا معنٰی ہے وہ لڑکیاں جن کے باپ کا انتقال ہوگیا ہو،خواہ وہ بالغ ہوگئی ہوں یا ابھی نابالغ ہوں،دونوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔علامہ ابن تیمیہؒ نے لکھا ہے:

''کتاب وسنت میں لفظ 'یتیمۃ' کا استعمال خاص طور پر بے باپ کی کم سن لڑکی ہی کے لیے ہوا ہے، جو ہنوز بالغ نہ ہوئی ہو۔یہی اس لفظ کا اصل مدلول اور اس کی حقیقت ہے۔کہیں کہیں بالغ لڑکی کو مجازاً 'یتیمہ' کہا گیا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ یتیمہ کا اطلاق بالغ اور نابالغ دونوں طرح کی لڑکیوں پر ہوسکتا ہے۔یہ کہنا کہ اس کا اطلاق صرف بالغ لڑکی پر ہوگا، کسی بھی طرح درست نہیں ہے۔''۱۰

قرآن مجید میں احکامِ عدّت کے ضمن میں بیان کیا گیا ہے:

**وَالّٰٓئِیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِن نِّسَائِکُمْ إِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُھُنَّ ثَلٰثَۃُ أَشْھُرٍ وَالّٰٓئِیْ لَمْ یَحِضْنَ وَأُوْلَاتُ الْأَحْمَالِ أَجَلُھُنَّ أَن یَضَعْنَ حَمْلَھُنَّ۔**(الطلاق:۴)

''اور تمہاری عورتوں میں سے جو حیض سے مایوس ہوچکی ہوں،ان کے معاملے میں اگر تم لوگوں کو کوئی شک ہو تو ان کی عدّت تین ماہ ہے۔یہی حکم ان عورتوں کا ہے جنہیں ابھی حیض نہ آیا ہو اور حاملہ عورتوں کی عدّت کی حد یہ ہے کہ ان کا وضع حمل ہوجائے۔''

**الّٰٓئِیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ** (جو حیض سے مایوس ہوچکی ہوں) سے مراد وہ عورتیں ہیں جن کا حیض عمر کی زیادتی کی وجہ سے بند ہوگیا ہو۔**وَالّٰٓئِیْ لَمْ یَحِضْنَ** کا اطلاق ان عورتوں پر ہوسکتا ہے جو بلوغت کی عمر کو پہنچ گئی ہوں، لیکن کسی وجہ سے انہیں حیض نہ آیا ہو اور ان چھوٹی لڑکیوں پر بھی جنھیں نابالغ ہونے کی وجہ سے ابھی حیض نہ

آیا ہو)۔ أُولَاتُ الْأَحْمَالِ سے مراد حاملہ عورتیں ہیں، جن کا حیض حمل کی وجہ سے رکا ہوا ہو۔ اس آیت میں ان عورتوں کی عدّت بیان کی گئی ہے۔وہ عورتیں جنہیں معمول کے مطابق حیض آ رہے ہوں، ان کی عدّت سورۃ البقرۃ: ۲۲۸ میں مذکور ہے۔سورۂ طلاق کی آیتِ بالا میں عدّتِ طلاق کا بیان ہے۔ طلاق کی نوبت نکاح کے بعد آتی ہے۔اس سے اشارۃً معلوم ہوتا ہے کہ بلوغت سے قبل لڑکی کا نکاح ہوسکتا ہے۔اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس صورت میں شوہر اس کے ساتھ خلوت بھی کرسکتا ہے۔اس لیے کہ مطلّقہ عورت کے لیے عدت کا سوال اسی صورت میں پیدا ہوتا ہے جب شوہر کی اس کے ساتھ خلوت ہوچکی ہو۔

کیا نابالغ لڑکی کا نکاح کیا جاسکتا ہے؟اس سلسلے میں علماء کے درمیان اختلاف ہے۔بعض اس کی اجازت دیتے ہیں،بعض ناجائز قرار دیتے ہیں۔اس ضمن میں امام ترمذیؒ نے لکھا ہے:

> ''کم سن لڑکی کے نکاح کے معاملے میں اہل علم کا اختلاف ہے۔بعض کہتے ہیں کہ اگر اس کا نکاح کردیا جائے تو وہ اس کے بالغ ہونے تک موقوف رہے گا۔بالغ ہونے کے بعد اسے خیارِ بلوغ حاصل ہوگا۔وہ چاہے تو نکاح باقی رکھے اور چاہے تو فسخ کردے۔ یہ بعض تابعین اور دوسرے اہل علم کا قول ہے۔بعض کہتے ہیں کہ لڑکی کا نکاح بلوغت سے قبل جائز نہیں ہے اور نکاح کے معاملے میں اسے خیارِ بلوغ حاصل نہیں ہوتا۔یہ سفیان ثوری، شافعی اور دیگر اہل علم کا قول ہے۔احمد اور اسحاق نے کہا ہے: جب لڑکی نو سال کی ہوجائے، اس وقت اس کا نکاح کیا جائے اور وہ اسے قبول کرلے تو یہ نکاح جائز ہے۔اس صورت میں بالغ ہونے کے بعد اسے (نکاح کو رد کرنے کا) اختیار نہیں حاصل ہوگا۔''[۱۱]

فقہاء کے اختلاف کی بنیاد یہ سوالات ہیں کہ کب لڑکی کا نکاح پسندیدہ ہے؟ اور کب وہ نکاح کے قابل ہوجاتی ہے؟ جن فقہاء کے نزدیک نکاح کا مقصد جنسی آسودگی ہے انھوں نے بلوغت سے قبل نکاح کو ناجائز کہا ہے۔دوسرے فقہاء کے نزدیک بلوغت

سے قبل نکاح کی گنجائش تو ہے، لیکن ان کے نزدیک بھی بہتر اور پسندیدہ یہی ہے کہ لڑکے اور لڑکی کا نکاح اس وقت کیا جائے جب وہ بالغ ہو چکے ہوں، تاکہ نکاح کے مقاصد کی تکمیل صحیح طریقے سے ہو۔

## حضرت عائشہؓ کے نکاح کے وقت ان کی عمر

کم سنی میں نکاح کے جواز کی دلیل کے طور پر ام المومنین حضرت عائشہؓ کے نکاح کا معاملہ پیش کیا جاتا ہے۔ حدیث وسیرت کی کتابوں میں یہ روایت مذکور ہے:

عَن عَائِشَةَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ تَزَوَّجَهَا وَهِيَ بِنتُ سِتِّ سِنِينَ، وَأُدخِلَت عَلَيهِ وَهِيَ بِنتُ تِسعٍ، وَمَكَثَت عِندَهُ تِسعاً۔ ۱۲

''حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے جب ان سے نکاح کیا اس وقت ان کی عمر چھ(۶) برس تھی، رخصتی کے وقت وہ نو(۹) برس کی تھیں اور آپؐ کے پاس وہ نو(۹) برس رہیں۔''

اس موضوع پر کئی تحقیقات منظر عام پر آ گئی ہیں، جن میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ رخصتی کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر درحقیقت انیس(۱۹) برس تھی، روایتوں میں دہائی کا ہندسہ حذف ہو گیا ہے۔۱۳ اس وقت اس پر محاکمہ اور بحث کا موقع نہیں ہے۔ اگر انہی روایتوں کو تسلیم کر لیا جائے جن میں رخصتی کے وقت ام المومنین کی عمر نو(۹) برس قرار دی گئی ہے، تب بھی یہ موضوع کئی پہلوؤں سے غور وفکر کا تقاضا کرتا ہے:

۱۔ اسلام نے نکاح کے معاملے میں عمر کو زیادہ اہمیت نہیں دی ہے، بلکہ وہ خوش گوار ازدواجی تعلقات پر زور دیتا ہے۔ لڑکے اور لڑکی کی جو بھی عمر ہو، وہ اسے گوارا کرتا ہے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت عائشہؓ کے مابین ازدواجی تعلقات نہایت خوش گوار اور مثالی تھے۔ نو سالہ رفاقت میں دونوں کے درمیان ناموافقت یا بے اطمینانی کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔

۲۔ بعض رسوم و روایات ایسی ہوتی ہیں جنہیں کسی سماج میں معیوب سمجھا جاتا ہے تو دوسرے سماج میں بغیر کسی ناپسندیدگی کے ان پر عمل کیا جاتا ہے۔ یہی معاملہ کم سنی کی

شادی کا ہے۔عہدِ جاہلیت میں اس کا معمول تو نہیں تھا، لیکن اسے معیوب بھی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ تاریخی روایات میں عہدِ جاہلیت اور عہدِ نبوی دونوں میں کم سنی کی شادی کے متعدد واقعات کا تذکرہ ملتا ہے۔

۳۔ بلوغت کی کوئی حد مقرر نہیں کی جاسکتی۔اسی طرح عورت کی پیداواری صلاحیت کی ابتدائی اور انتہائی مدت متعین کرنا بھی ممکن نہیں ہے۔جسمانی نشوونما، غذائیت، آب وہوا، خاندان اور دیگر عوامل اس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ سرد ممالک میں آٹھ نو برس کی عمر میں لڑکیوں کے یہاں ولادت کی خبریں اخبارات کی زینت بنتی رہتی ہیں۔ پھر گرم ممالک میں لڑکی کے جلد بالغ ہوجانے کو مستبعد نہیں قرار دیا جاسکتا۔[۱۴]

## کم سنی کی شادی روکنے کے لیے قانون کی ضرورت نہیں

کم سنی کی شادی روکنے کے لیے ملک میں گزشتہ سو برس میں متعدد قوانین بنائے گئے ہیں اور ان میں بہتری لانے کے لیے ترمیمات کی گئی ہیں، لیکن جیسا کہ سروے رپورٹوں سے ظاہر ہے، اب تک اس پر قابو نہیں پایا جاسکتا ہے اور قوانین کی خلاف ورزی پر سزاؤں کے تذکرہ اور نفاذ کے باوجود مختلف سماجوں میں اس کا معمول جاری ہے۔اس سے ظاہر ہے کہ محض قانون بنا کر کم سنی کی شادی پر روک نہیں لگائی جاسکتی۔

مناسب ہے کہ بلوغت سے قبل شادی کی حوصلہ شکنی کی جائے اور ضرورت ہو تو اس پر پابندی عائد کردی جائے، لیکن بلوغت کے بعد لڑکوں اور لڑکیوں کو قانونی طور پر شادی کی اجازت ہونی چاہیے۔اگر بلوغت کے بعد بھی شادی پر پابندی عائد کی جائے گی اور اس کے لیے قانون بنایا جائے گا تو اس سے اس پر روک تو نہیں لگے گی، البتہ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بغیر شادی کے جنسی تعلقات کی طرف مائل ہوں گے۔اس کے نتیجے میں سماج میں جو فساد برپا ہوگا وہ کم سنی کی شادی کی مضرتوں سے کہیں بڑھ کر ہوگا۔

پاکستان میں ۱۹۵۵ء کے اواخر میں عائلی قوانین کی تدوین کے لیے حکومت نے ایک کمیشن مقرر کیا تھا۔اس کی جانب سے ایک سوال نامہ تیار کرکے علماء، دانش وروں اور

سرکردہ شخصیات کی خدمت میں بھیجا گیا۔ کیا کم سنی کی شادیوں کو روکنے کے لیے قانون بنانا ضروری ہے؟ اس سوال کا مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے یہ جواب دیا تھا:

''کم سنی کی شادیاں روکنے کے لیے کسی قانون کی حاجت نہیں اور اس کے لیے ۱۸؍سال اور ۱۵؍سال کی عمر مقرر کر دینا بالکل غلط ہے۔ ہمارے ملک میں ۱۸؍سال کی عمر سے بہت پہلے ایک لڑکا جسمانی طور پر بالغ ہوجاتا ہے اور لڑکیاں بھی ۱۵؍سال سے پہلے جسمانی بلوغ کو پہنچ جاتی ہیں۔ ان عمروں کو از روئے قانون نکاح کی کم سے کم عمر قرار دینے کے معنیٰ یہ ہیں کہ ہمیں اس سے کم عمر والے لڑکوں اور لڑکیوں کی صرف شادی پر اعتراض ہے، کسی دوسرے طریقے سے جنسی تعلقات پیدا کر لینے پر کوئی اعتراض نہیں۔ شریعتِ اسلام نے اس طرح کی مصنوعی حد بندیوں سے اسی لیے احتراز کیا ہے کہ یہ درحقیقت بالکل غیر معقول ہیں۔ اس کے بجائے یہ بات لوگوں کے اپنے ہی اختیارِ تمیّزی پر چھوڑ دینی چاہیے کہ وہ کب نکاح کریں اور کب نہ کریں۔ لوگوں میں تعلیم اور عقلی نشوونما کے ذریعہ سے جتنا زیادہ شعور پیدا ہوگا اسی قدر زیادہ صحیح طریقہ سے وہ اپنے اس اختیاری تمیّزی کو استعمال کریں گے اور کم سنی کے نامناسب نکاحوں کا وقوع، جواب بھی ہمارے معاشرے میں کچھ بہت زیادہ نہیں ہے، روز بروز کم تر ہوتا چلا جائے گا۔ شرعاً ایسے نکاحوں کو جائز صرف اس لیے رکھا گیا ہے کہ بسا اوقات کسی خاندان کی حقیقی مصلحتیں اس کی متقاضی ہوتی ہیں۔ اس ضرورت کی خاطر قانوناً اسے جائز ہی رہنا چاہیے اور اس کے نامناسب رواج کی روک تھام کے لیے قانون کے بجائے تعلیم اور عام بیداری کے وسائل پر اعتماد کرنا چاہیے۔ معاشرے کی ہر خرابی کا علاج قانون کا لٹھ ہی نہیں ہے۔''[۱۵]

## مسلم پرسنل لا میں مداخلت نہ کی جائے

ملک کے دستور میں مختلف اقلیتوں کو ان کے پرسنل لا کے مطابق عمل کرنے کی

آزادی دی گئی ہے۔یہ آزادی مسلمانوں کو بھی حاصل ہے۔شریعت ایپلیکیشن ایکٹ ۱۹۳۷ء نکاح، طلاق، وراثت اور دیگر عائلی معاملات میں ان کے حقوق کا تحفظ فراہم کرتا ہے۔اس لیے کم سنی کی شادی کی ممانعت کے سلسلے میں بننے والے کسی قانون سے مسلمانوں کو استثنا حاصل ہونا چاہیے۔اسلامی تعلیمات کی رؤ سے شادی بلوغت کے بعد پسندیدہ ہے، بلوغت سے قبل ناگزیر مصالح کے تحت جائز تو ہے، لیکن مستحسن نہیں ہے۔ اس تعلق سے اگر لوگوں میں بیداری لانے کی ضرورت ہوگی تو یہ کام مسلمان علماء اور اسلامی شریعت کے ماہرین انجام دیں گے۔علامہ سید سلیمان ندویؒ نے لکھا ہے:

> ''اگر مسلمانوں کی حالت کا اقتضا ہو کہ عدمِ بلوغ کے غیر مستحسن نکاح سے لوگوں کو روکا جائے تو مسلمانوں کا امام ایسا کرسکتا ہے۔البتہ غیر مسلم حکومت میں ایسا نہیں ہوسکتا، سوائے اس کے کہ مسلمان قاضیوں کا تقرر ہو اور وہ اسلامی مصالح کی بنیاد پر اس طرح کا کوئی فیصلہ کریں۔آگے انہیں اس سلسلے میں تعزیرات جاری کرنے کا بھی اختیار ہے، لیکن اس طرح کی تمام صورتوں میں نکاح اور اس کے لوازم ناجائز نہ ہوں گے۔'' [۱۶]

سماج میں رائج ناپسندیدہ رسوم وروایات کی روک تھام کا ذریعہ محض قانون سازی نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے عوام کی تعلیم وتلقین اور رائے عامہ کی بیداری کے مختلف طریقے اختیار کرنے چاہییں۔

## حواشی ومراجع


1- The National Family and Health Survay (NHFC) 2019-21, conducted by the Union Ministry of Health anf Family Welfare, uploaded on the Goverment of India's Ministry of Health and Family Welfare website.

2- Lok Sabha unstared question No. 4526, Ministry of Women and Child Development March 20 , 2020.

۳۔ صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب الترغیب فی النکاح

۴۔ صحیح بخاری:۱۹۰۵،صحیح مسلم:۱۴۰۰

۵۔ صحیح مسلم،شرح النووی،مؤسسۃ قرطبۃ:۱۹۹۴ء،طبع دوم،۹/۲۴۶

۶۔ سنن الترمذی،ابواب النکاح، باب ماجاء اذا جاء کم من ترضون دینہ فزوجوہ۔۱۰۸۴

۷۔ ترمذی،ابواب النکاح، باب ماجاء فی اکراہ الیتیمۃ علی التزویج،۱۱۰۹

۸۔ مشکوٰۃ المصابیح، ۳۱۳۸، بہ حوالہ بیہقی فی شعب الایمان

۹۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر،سورۃ النساء، ۴۲۹۸

۱۰۔ مجموع فتاویٰ شیخ الاسلام احمد بن تیمیہ،جمع وترتیب: عبدالرحمٰن بن محمد بن قاسم،طبع سعودی عرب ۱۳۹۸ھ،۳۲/۴۶

۱۱۔ ترمذی،ابواب النکاح، باب ماجاء فی اکراہ الیتیمۃ علی التزویج

۱۲۔ بخاری، کتاب النکاح، باب النکاح الرجل ولدہ الصغار،۴۸۴۰

۱۳۔ ملاحظہ کیجیے: کشف الغمّہ عن عمران الامۃ،حکیم نیاز احمد،عمر سیدہ عائشہؓ پر ایک تحقیقی نظر،مولانا حبیب الرحمٰن کاندھلوی،حضرت عائشہؓ کی شادی اور اصل عمر،مولانا محمد فاروق خاں،**سن السیدۃ عائشہ یوم نکاحھا**،مولانا عنایت اللہ اسد سبحانی۔روایتی موقف کے دلائل کے لیے ملاحظہ کیجیے:**السنا الوھّاج فی سن عائشہ عبد الزواج**،فہد بن محمد بن محمد الغفیلی،عمر عائشہ کی تحقیق اور کاندلوی تلبیس کا ازالہ، حافظ ثناء اللہ ضیاء، اور مقالہ: رخصتی کے وقت ام المومنین عائشہؓ کی عمر، ڈاکٹر عمار خاں ناصر،مجلۃ الشریعہ گوجرانوالہ، اپریل۲۰۱۲ء

۱۴۔ اس موضوع پر تفصیل سے ملاحظہ کیجیے راقم سطور کی کتاب 'اسلام پر بعض اعتراضات کا جائزہ' مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز،۲۰۲۲میں اور زندگی کے عام فقہی مسائل، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی، جلد پنجم،ص ۱۹۵۔۱۹۸

۱۵۔ تفہیمات،سید ابوالاعلیٰ مودودی،مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی،۲۰۰۲ء،جلد سوم،ص۱۹۳۔۱۹۴

۱۶۔ مکتوبات سلیمانی،سید سلیمان ندوی،صدق جدید بک ایجنسی لکھنؤ،۱۹۶۷ء،جلد اول،ص۲۵۲

# یہودی الٰہیات کا تنقیدی جائزہ

——— حافظ محمد احسن رضا

مذاہب کی درجہ بندی میں یہودیت سامی مذاہب میں پہلا مذہب ہے۔ اس کو ماننے والے یہود کہلاتے ہیں۔ ان کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ نے بہت سے انبیاء و رسل مبعوث کیے۔ انھوں نے سب سے پہلے لوگوں کے عقائد وافکار کی اصلاح کا فریضہ انجام دیا اور بنیادی طور پر توحید کی دعوت دی۔ وقت گزرنے کے ساتھ یہود، جو توحید پرست تھے، دین اور احکامِ الٰہی سے انحراف اُن کی سرشت کا حصہ بن گیا تھا۔ قرآن کریم کی متعدد آیات اس بات کی صراحت کرتی ہیں کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قوم کے لیے توحید کے علم بردار بن کر آئے۔ انھوں نے صرف اللہ کی عبادت کا حکم دیا اور معبودانِ باطلہ کا رد کیا۔ دیگر انبیاء کرام کی طرح حضرت موسیٰ نے بھی توحید کا درس دیا تھا۔ قرآن مجید میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو مخاطب کر کے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

إِنَّنِيٓ أَنَا اللّٰهُ لَآ إِلَٰهَ إِلَّآ أَنَا فَاعۡبُدۡنِيۡ وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكۡرِيۡ (طٰہٰ:۱۴)

’’میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں، لہٰذا میری عبادت کرو اور میری یاد کے لیے نماز قائم کرو۔‘‘

## معبودِ باطل کا مطالبہ

حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کو اس بات کی بھی تعلیم دیتے تھے کہ وہ اپنے رب کی بندگی سے غافل نہ ہوں۔ قوم کی باغیانہ روش نے انھیں شرک میں مبتلا کر دیا اور وہ احکام شریعت سے منحرف ہو گئے۔ اللہ رب العزت نے بنی اسرائیل کو فرعون سے نجات دی، اسے دریا میں غرق کر دیا اور ان کی عزت و رفعت کو برقرار رکھا۔ اس عظیم معجزے کے

باوجود قوم نے حضرت موسیٰؑ سے معبود باطل کا مطالبہ کر دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بنی اسرائیل کا گزر مصر کے ایک ایسے علاقے سے ہوا جہاں کے لوگ بت پرستی کا شکار تھے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اپنی تفسیر 'تفہیم القرآن' میں اس آیت کے ذیل میں لکھا ہے:

''بنو اسرائیل نے جس مقام سے بحر احمر کو عبور کیا وہ غالباً موجودہ سویز اور اسماعیلیہ کے درمیان کوئی مقام تھا۔ کیوں کہ جزیرہ نمائے سینا کا مغربی اور شمالی حصہ مصر کی سلطنت میں شامل تھا۔ جنوب کے علاقے میں تانبے کی کانیں تھیں جو کہ مصر کی معیشت کا اہم مقام تھیں اور ان کی حفاظت کے لیے مصریوں نے چند مقامات پر چھاؤنیاں قائم کر رکھی تھیں۔ ایک چھاؤنی مَفقہ کے مقام پر تھی، جہاں مصریوں کا ایک بہت بڑا بت خانہ تھا۔ اس کے قریب ہی قدیم زمانہ سے سامی قوموں کی چاند دیوی کا بت خانہ تھا۔ غالباً انہی مقامات سے گزرتے ہوئے انہوں نے ایک مصنوعی خدا کی ضرورت محسوس کی ہوگی۔''[۲]

قرآن کریم نے اس نامناسب فرمائش کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

قَالُوْا یٰمُوْسَی اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ (الاعراف:۱۳۸)

(انہوں نے کہا؛ اے موسیٰ! ہمارے لیے بھی ایک ایسا معبود بنا دیجیے جیسے کہ ان کے معبود ہیں۔)

مصنوعی خدا کا سوال بنی اسرائیل کی طرف سے جہالت اور بے عقلی کی بات تھی۔ اکثر مفسرین نے ان کی اس حرکت کو باغیانہ روش قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر وہبہ زحیلی (م۲۰۱۵ء) نے اس آیت کے ضمن میں تفصیل سے کلام کیا ہے اور سرکشی اور انحراف پسندی کی عادات کو مصنوعی خدا کے مطالبہ کی وجہ قرار دیا ہے۔ اسی وجہ سے وہ معبودِ برحق کو چھوڑ کر انتہا درجے کی گم راہی اور جہالت میں مبتلا ہو گئے۔ حضرت موسیٰؑ نے ان کو تنبیہ کی، مصر والوں کی مشابہت اختیار کرنے سے منع کیا اور انھیں بتایا کہ اس مطالبہ کے باعث ان کے سارے اعمال اکارت ہو جائیں گے۔[۲]

بنی اسرائیل ذہنی طور پر اہل مصر کی غلامی کا اس حد تک شکار ہو چکے تھے کہ مصر

سے نکل آنے کے ستّر سال بعد بھی ان کی مستقل حالت زار پر حضرت یوشع علیہ السلام نے انھیں ان الفاظ میں متنبہ کیا تھا:

''تم خداوند کا خوف رکھو اور نیک نیتی اور صداقت کے ساتھ اس کی پرستش کرو اور ان دیوتاؤں کو دُور کر دو جن کی پرستش تمہارے آباء واجداد مصر میں کرتے تھے اور تم خداوند کی پرستش کرو۔ اور اگر تمہیں ان کی پرستش بری معلوم ہو تو آج ہی تم اُسے جس کی پرستش کرو گے چن لو۔ اب رہی میری اور میرے گھرانے کی بات، ہم تو خداوند ہی کی پرستش کریں گے۔''[۳]

طویل عرصہ کی غلامی کے اثرات ان کے دل و دماغ پر مسلط ہو گئے تھے، چنانچہ مصر سے نکلتے ہی بت پرستی کی عادت بتوں کو دیکھتے ہی اجاگر ہوگئی اور یہ لوگ اُن کے سامنے سر بہ سجود کی کیفیت کا شکار ہو گئے۔ کیوں کہ انہی معبودانِ باطلہ کی پرستش ان کے اسلاف بھی کرتے تھے۔ اس لیے بنی اسرائیل کا حضرت موسیٰؑ سے معبودِ باطلہ کا مطالبہ کوئی حیران کن بات نہ تھی۔ اس ذلت آمیز زندگی پر وہ خوش تھے اور راضی بھی۔

## بچھڑے کی پوجا

مشیتِ الٰہی بنی اسرائیل کی ہدایت اور فلاح کا فیصلہ کر چکی تھی ۔ رب ذوالجلال نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہِ طور پر بلایا اور احکام الٰہی سے مشرف فرمایا، لیکن قوم ان کی غیر موجودگی میں بچھڑے کی پوجا کرنے لگی۔ قرآن کریم نے اس کا صراحت سے ذکر کیا گیا ہے۔ سامری نے کہا:

قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَ كَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ (طٰہٰ:۹۶)

(اس نے کہا: میں نے دیکھی ایسی چیز جو لوگوں نے نہ دیکھی، پس میں نے مٹھی بھر لی رسول کی سواری کے نشان قدم کی خاک سے، پھر اسے ڈال دیا [اس ڈھانچہ میں] اور اس طرح میرے لیے میرے نفس نے یہ بات آراستہ کر دی۔)

علامہ آلوسی (م ۱۲۷۰ھ) نے 'روح المعانی'[۵] میں، امام رازی (م ۶۰۴ ھ)

'مفاتیح الغیب' ۴ میں اس آیت کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے کہ سامری حضرت موسیٰؑ کی غیر حاضری کا فائدہ اُٹھایا اور لوگوں کو دین موسوی کی تعلیمات سے منحرف کرنے میں کام یاب ہو گیا۔ جب بنی اسرائیل فرعون کی غلامی سے نکل کر بھاگے تو اس وقت فتنہ پرداز شخص سامری نے قوم کے زیورات اکٹھے کر کے ایک بچھڑے کی شکل دے دی اور اس کی ساخت کچھ اس طرح بنائی کہ (ہوا چلنے پر) اس سے بیل جیسی آواز نکلتی تھی۔ اس نے قوم کو بہکایا کہ تمہارا اور تمہارے نبی موسیٰؑ کا معبود تو یہی ہے، اسے چھوڑ کر موسیٰؑ معلوم نہیں کہاں چلے گئے ہیں۔

بنی اسرائیل سخت منفعل مزاج رکھتی تھی۔ بچھڑے کی پرستش اُن کا مزاج بن گئی تھی، اس لیے وہ سامری کی باتوں میں آ گئے۔ حضرت ہارونؑ نے، جو اس وقت حضرت موسیٰؑ کے جانشین تھے، انہیں لاکھ سمجھایا کہ یہ فتنہ ہے، تمہارا معبود یہ بچھڑا نہیں، بلکہ رحمٰن کی ذات ہے، اس لیے گم راہی کا شکار نہ ہو اور میری اتباع کرو، لیکن ان لوگوں نے اُن کی ایک نہ سنی اور کہنے لگے کہ ہم حضرت موسیٰؑ کی واپسی تک اس کی پرستش کرتے رہیں گے۔ حضرت موسیٰؑ نے واپس آ کر قوم کی سخت سرزنش کی اور اس خودساختہ معبود کو نذرِ آتش کر کے دریا برد کر دیا۔

قرآن کریم نے اس واقعہ کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

وَ لَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ یٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ وَ اِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِیْ وَ اَطِیْعُوْۤا اَمْرِیْ (طٰہٰ:۹۰)

(اور بے شک کہا تھا انہیں ہارون نے (حضرت موسیٰ کی واپسی سے پہلے) اے میری قوم! تم تو فتنہ میں مبتلا ہو گئے اس سے اور بلاشبہ تمہارا رب تو وہ ہے جو بہت مہربان ہے، پس تم میری پیروی کرو اور میرا حکم مانو۔)

اس واقعے کا ذکر تورات میں ان الفاظ میں ملتا ہے:

''اے اسرائیل! یہ تمہارا معبود ہے اور یہ تمہیں مصر سے نکال لایا ہے... توراۃ کے ماننے والوں نے بنی اسرائیل کے جرم کو ہلکا کرنے کے لیے یہ سارا کاروبار حضرت ہارون علیہ السلام کی طرف منسوب کر دیا۔''۶

بائبل اس جرم کا قصوروار حضرت ہارونؑ کو قرار دیتی ہے۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ حضرت موسیٰؑ نے پہاڑ سے اترنے میں دیر لگائی تو وہ حضرت ہارونؑ کے پاس جمع ہوئے اور کہنے لگے: ''اُٹھ، ہمارے لیے دیوتا بنا دے، جو ہمارے آگے چلے، کیوں کہ ہم نہیں جانتے اس مرد (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) کو، جو ہم کو ملک مصر سے نکال کر لایا۔''[۷]

یہود کو سب سے پہلا اور بنیادی حکم توحید اور خدا پرستی کا دیا گیا تھا اور شرک و بت پرستی سے باز رہنے کی تلقین کی گئی تھی، مگر وہ مصریوں کے شرک و بت پرستی سے اس قدر مرعوب اور ایسی ذہنی و اخلاقی پستی میں مبتلا تھے کہ فرعون کے مظالم سے چھٹکارا پانے اور اللہ کی قدرت وجلال کے حیرت انگیز واقعات کا مشاہدہ کرنے کے فوراً بعد انھوں نے بت پرستی کی تمنا کی اور پیغمبر وقت حضرت موسیٰؑ سے اپنے لیے جھوٹے خدا کا مطالبہ کر دیا۔ حضرت موسیٰؑ اس نامعقول مطالبے پر سخت برہم ہوئے اور فرمایا: ''نادانو! اللہ نے تم پر عظیم الشان انعامات کیے اور تم خود اس کی کرشمہ سازی کے حیرت انگیز واقعات کا بار بار مشاہدہ چکے ہو، اس کے باوجود شرک پر قائم رکھنا چاہتے ہو اور ایسی حماقت کی باتیں کرتے ہو۔'' یہود زبان سے ضرور اللہ پر ایمان اور توحید کے اقرار کے مدّعی تھے، لیکن ان کے عقیدہ و عمل سے اس کی کوئی تائید نہیں ہوتی تھی۔

یہود کے نزدیک یہ امر مسلّم تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کی جائے اور کسی کو اس کا ساجھی اور شریک نہ بنایا جائے، مگر اس کے باوجود ان کا عمل اس کے خلاف تھا، اس لیے قرآن نے ان کو یہ تناقض دؤر کرنے، توحید خالص کا علم بردار بن جانے اور شرک و کفر سے بیزاری اختیار کرنے کی تلقین کی، مگر انہوں نے اس مخلصانہ دعوت کو قبول نہیں کیا۔ قرآن کریم نے یہود کی ایمانی کیفیت کا اس طرح ذکر کیا ہے:

اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ یَزۡعُمُوۡنَ اَنَّهُمۡ اٰمَنُوۡا بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ وَمَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِکَ یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یَّتَحَاکَمُوۡۤا اِلَی الطَّاغُوۡتِ وَ قَدۡ اُمِرُوۡۤا اَنۡ یَّکۡفُرُوۡا بِهٖ وَ یُرِیۡدُ الشَّیۡطٰنُ اَنۡ یُّضِلَّهُمۡ ضَلٰلًا بَعِیۡدًا (النساء:۶۰)

(کیا تم نے لوگوں کو نہیں دیکھا کہ جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ وہ اس چیز پر

ایمان لائے جو تم پر اور تم سے پہلے اتاری گئی ہے، لیکن چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات کا تصفیہ طاغوت سے کرائیں، حالاں کہ انھیں اس کے انکار کا حکم دیا گیا ہے اور شیطان چاہتا ہے کہ انہیں نہایت دور کی گم راہی میں کر دے۔)

اسی طرح دیگر آیاتِ مبارکہ میں ان کے ایمان کی نفی کی گئی ہے اور ان پر لعنت ملامت بھی کی گئی ہے۔ ایمانیات کے حوالے سے بھی یہود کا ایمان متزلزل تھا اور انہوں نے تشریع اور قانون سازی کے اختیارات اللہ کے بجائے اپنے فقہاء کے سپرد کر رکھے تھے۔ جس کو وہ چاہتے حلال یا حرام قرار دے دیتے تھے اور یہ اس کی پیروی کرتے تھے۔ یہود کی اس ایمانی کیفیت کو قرآن کریم نے یوں واضح کیا ہے:

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِيْنَ أُوتُواْ نَصِيْباً مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُونَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوتِ وَيَقُولُونَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُواْ هٰؤُلاء أَهْدَى مِنَ الَّذِيْنَ آمَنُواْ سَبِيْلاً (النساء:۵۱)

(کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کتاب الٰہی کا ایک حصہ عطا کیا گیا تھا۔ یہ لوگ جبت اور طاغوت پر عقیدہ رکھتے تھے اور کافروں کو ایمان والوں سے زیادہ ہدایت یافتہ بتاتے ہیں۔)

یہود کفر و شرک میں مبتلا ہو کر قرآن کی تعلیم ہی نہیں، بلکہ دین کی اصل و اساس کو منہدم کر رہے تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے شرک کے بارے میں صراحت کے ساتھ فرمایا کہ اس گناہ کو کسی حال میں بھی معاف نہیں کرے گا۔ ارشادِ ربانی ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (النساء:۴۸)

(بے شک اللہ اس کو معاف نہیں کرے گا کہ اُس کے ساتھ کسی کو شریک بنایا جائے۔ اس کے علاوہ (دوسری معصیتوں کو) وہ جس کے لیے چاہے گا، معاف کر دے گا۔)

اس سخت تنبیہ کے باوجود یہود شرک کرتے رہے اور اللہ کی ذات کے ساتھ بیٹے کی نسبت گھڑ لی۔ یہود کے اس کفر و عدم ایمان کی فکر پر اللہ نے ضرب لگا کر اس کی نفی کی ہے۔ اس فکر کے نتیجے میں یہود کی ایک جماعت اس نظریے کی قائل تھی اور یہی فکر ان

کی ابھی تک چلی آ رہی ہے۔ کیوں کہ یہود، جو قرآن کے ہر فیصلے پر منحرف ہوتے تھے، قرآن کے اس دعویٰ پر خاموش رہے اور ان میں اس دعویٰ کے تردید کی جرأت نہ ہوئی۔ ارشادِ خداوندی ہے:

وَ قَالَتِ الْیَهُوْدُ عُزَیْرُنِ ابْنُ اللّٰهِ (التوبۃ:۳۰)

(اور یہود نے کہا کہ عزیر اللہ کے بیٹے ہیں۔)

مولانا عبدالحق حقانیؒ (م ۱۳۳۵ھ) کا موقف ہے کہ حضرت عزیرؑ کو اللہ کا بیٹا کہنے والے تمام یہود نہ تھے، بلکہ ایک خاص فرقہ تھا، جو کہ بہ قول بعض علماء یہود کے بنی قریظہ تھے۔[۱۱] یہود کا ایک گروہ جو ابن اللہ کے عقیدے کا قائل تھا وہ یمن کا صدوقی فرقہ تھا۔[۱۲] یعنی یہ تمام یہود کا عقیدہ نہیں تھا، تاہم ان کی ایک جماعت ضرور اس کی قائل تھی۔ اب اس عقیدے کے لوگ ختم ہو چکے ہیں۔ اسی لیے یہود، جو قرآن کی ہر بات پر اعتراض کرتے تھے، وہ اس کی تردید کی جرأت نہ کر سکے۔ حضرت عزیرؑ کو یہود کے نزدیک اس قدر غیر معمولی اہمیت اس بنا پر حاصل ہوگئی تھی کہ بخت نصر نے بیت المقدس کو تباہ کر کے یہود کو بائبل میں قید کر دیا تھا اور ان کے مذہبی سرمایے کو جلا دیا گیا۔ ایک عرصہ کے بعد جب یہود بابل سے رہا ہو کر یروشلم واپس لوٹے تو حضرت عزیرؑ نے اپنی یادداشت سے تورات کو از سرِ نو لکھوایا۔ اس کے بعد سے انہی کے مرتب کیے ہوئے نسخہ کو اصل تورات کا بدل سمجھا جانے لگا۔ اس خدمت اور کتاب و شریعت کی تجدید کے نتیجے میں یہود کے نزدیک حضرت عزیرؑ کا مرتبہ بہت بڑھ گیا تھا اور بعض لوگ ان کو حضرت موسیٰؑ کے برابر سمجھنے لگے تھے، یہاں تک کہ ان کے بارے میں اس قدر غلو کا شکار ہو گئے تھے کہ انہیں اللہ کا بیٹا سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ یہود کی اس فکر کی توثیق جیوش انسائیکلوپیڈیا (Jewish Encyclopedia) سے بھی ہوتی ہے:

"The composition of the pentatcuc:not Moses (AS)but to Isra."(10)

(تورات کو مرتب کرنے والے حضرت موسیٰ علیہ السلام نہیں، بلکہ حضرت عزراؑ ہیں۔)

علامہ ابن جریر(م ۳۱۰ھ)[۱۱]،امام بغویؒ(م۵۱۰ھ)[۱۲]اورمولانا ثناء اللہ پانی پتی[۱۳] (م ۱۲۲۵ھ) نے ایک روایت نقل کی ہے، جس کا مفہوم کچھ یوں ہے:

''عبید بن عمیرؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عزیرؑ کو بیٹا کہنے والا یہود میں صرف ایک شخص تھا، جس کا نام 'فنحاص بن عازورا' تھا۔ ایک اور روایت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ حضرت عزیرؑ کو اللہ کا بیٹا اس لیے کہا گیا تھا کہ جب آپ ان کے درمیان موجود تھے تو اس وقت تورات اور تابوت سکینہ بھی موجود تھا، مگر قوم اپنی خواہشات کی پجاری تھی، چنانچہ اللہ نے تابوت اُٹھا لیا اور تورات محو کروا دی۔ اس صورتِ حال میں حضرت عزیر علیہ السلام نے توبہ و استغفار کی تو اللہ نے دوبارہ تورات عطا کر دی۔ آسمان سے نور نازل ہوا اور آپؑ کو تورات عطا کردی گئی۔ آپؑ نے اعلان کیا کہ مجھے تورات ملی ہے تو قوم اکٹھی ہوگئی۔ آپؑ نے ان کو تورات کی تعلیم دی۔ کچھ عرصہ کے بعد تابوت واپس مل گیا۔ انھوں نے دیکھا کہ اس میں تورات رکھی ہوئی تھی۔ انھوں نے دونوں توراۃ کا موازنہ کیا تو حرف بہ حرف برابر پایا۔ کہنے لگے (حضرت) عزیرؑ پر یہ نوازش صرف اسی لیے ہوئی ہے کہ وہ اللہ کے بیٹے ہیں۔''

مذکورہ بالا آیتِ مبارکہ کے حوالے سے دیگر مفسرین نے ایک اور روایت نقل کی ہے، جس میں ان افراد کے نام مذکور ہیں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ سے حضرت عزیرؑ کے حوالے سے سوال کیا تھا۔ علامہ جصاص (م ۱۳۷۰ھ)[۱۴]، امام رازی[۱۵] اور مولانا ادریس کاندھلویؒ (م ۱۳۹۴ھ/۱۹۷۴ء) لکھتے ہیں:

حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ یہود کی ایک خاص جماعت آں حضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی، جن میں سلام بن مشکم، نعمان بن اوفی، شاس بن قیس اور مالک بھی صیف تھے۔ ان لوگوں نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر حضرت عزیرؑ کے متعلق یہ کہا: اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[۱۶]

دیگر مفسرین میں مولانا عبد الماجد دریا بادیؒ (م ۱۳۹۷ھ/۱۹۷۷ء) نے

تفسیر ماجدی ۱۷ میں اور مولانا مودودیؒ (م ۱۳۹۹ھ/ ۱۹۷۹ء) نے تفہیم القرآن ۱۸ میں ان کے اس عقیدے کو باطل قرار دیا ہے اور اختصار کے ساتھ دیگر مفسرین سے ملتی جلتی بات نقل کی ہے۔

## علماء واحبار کو رب بنالینا

قرآن نے یہود کی ایک اور بیماری کی طرف اشارہ کیا ہے، جس سے ان کے ایمان کے دعویٰ کی قلعی کھل جاتی ہے۔ اس میں ہے:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (التوبۃ:۳۱)

(انھوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے علماء اور راہبوں کو رب بنالیا ہے۔)

یہود نے اپنے علماء ومشائخ کو وہ درجہ دے دیا تھا جو اللہ کے لیے مخصوص ہے، چنانچہ انھوں نے تشریع وقانون سازی اور تحلیل وتحریم میں علما ومشائخ کو شریک کرلیا تھا۔ اسی حوالے سے اکثر مفسرین نے سنن ترمذی کی یہ روایت نقل کی ہے۔ حضرت عدی بن حاتمؓ بیان کرتے ہیں:

> ''میں نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت میری گردن میں سونے کی صلیب تھی آپ ﷺ نے فرمایا: اے عدی! اس بت کو اتار کر پھینک دو۔ پھر میں نے آپؐ سے سورۃ البراءۃ (التوبۃ) کی آیت ۳۱ کے متعلق پوچھا۔ آپؐ نے فرمایا: وہ اپنے علماء کی عبادت نہیں کرتے تھے، لیکن جب وہ کسی چیز کو حلال کردیتے تو وہ اس کو حلال کہتے تھے اور جب وہ کسی چیز کو حرام کردیتے تو وہ اسے حرام کہتے تھے۔'' ۱۹

یہود اپنی پاک بازی اور برتری کا ڈھنڈورا پیٹتے تھے اور اپنے آپ کو پیغمبر کی اولاد اور اللہ کے چہیتے کہتے تھے اور دعویٰ کرتے تھے کہ صرف وہی ہدایت پر ہیں۔ اس غرور نے انھیں آخرت سے غافل کردیا تھا اور وہ عذاب کے حوالے سے اتنے بے باک و بے خوف ہوگئے تھے کہ کہتے تھے: اوّل تو ہماری پکڑ نہیں ہوگی اور اگر ہوئی تو چند روز کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اللہ اور اس کے احکام کے بارے میں تنقیص اور تفریط کا شکار ہوگئے تھے اور اس اعلیٰ وارفع ذات کو اس قدر فروتر کردیا تھا کہ وہ نقائص وعیوب کا

مجموعہ بن گئی تھی۔ علامہ ابن تیمیہؒ (م ۷۲۸ھ) نے ذکر کیا ہے کہ یہود اللہ کی صفات کے بارے میں تفریط میں مبتلا ہو گئے تھے۔ چنانچہ اس کو مخلوق کے نقائص سے ملوّث سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ اللہ محتاج ہے اور ہم لوگ غنی ہیں۔۲۰

## اللہ کی شان میں گستاخیاں

یہود کی اللہ کی شان میں ناروا گستاخیوں کا ذکر کرتے ہوئے قرآن کریم ان کی ایمانی حالت کی عکاسی کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر بے حساب انعامات کیے، ان کے لیے منّ وسلویٰ اتارا اور ان پر بادل کا سائبان کیا۔ان انعامات کا تقاضا تھا کہ وہ معبودانِ باطلہ کی بجائے معبودِ برحق کے سامنے سربہ سجود ہوتے، مگر انھوں نے بغض وعناد اور تکبر جیسے قبیح اعمال کا ارتکاب کیا اور اللہ جلّ شانہ کی ذات اقدس پر براہِ راست حملہ کیا۔ ارشادِ ربانی ہے:

لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِيَآءُ

(آل عمران:۱۸۱)

(اللہ نے ان لوگوں کی بات سن رکھی ہے جنھوں نے کہا کہ اللہ محتاج ہے اور ہم غنی ہیں۔)

دوسری جگہ ہے:

وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُاللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ (المائدۃ:۶۴)

(اور یہود نے کہا کہ اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔)

دونوں آیتوں میں یہود کے طنز وتمسخر کا ذکر ہے۔ان کی ان ناروا باتوں پر سخت زجروتوبیخ کی گئی کہ فقر واحتیاج تو بندوں اور مخلوقات کے اوصاف ہیں۔ اللہ کی شان ان سے بہت اعلیٰ وارفع ہے۔اس آیت کے حوالے سے علامہ ابن کثیرؒ نے ایک روایت نقل کی ہے کہ یہود کہا کرتے تھے:

''اے محمد! تمہارا رب فقیر ہو گیا ہے اور اپنے بندوں سے قرض مانگ رہا ہے۔''۲۴

یہود کا اللہ کے بارے میں یہ گستاخانہ بات کہنا ان کے حرص وبخل کی وجہ سے تھا۔

حبِ جاہ ان کے دلوں میں حیا کی شمع گل کر چکی تھی۔ جس معبودِ برحق نے ان کو فضیلت، عنایات اور بادشاہت سے نوازا اور جس نے ان کو کامیابیوں سے نوازا، وہ خود کیسے کم زور اور فقیر ہوسکتا ہے!

مفسرین نے اس آیت کے ذیل میں لکھا ہے کہ اللہ کو فقیر اور محتاج قرار دینے کی وجہ ان کا اپنے غریب لوگوں اور غریب اہلِ ایمان کے دلوں میں تشکیک ڈال کر نبی کریم ﷺ کی تکذیب کرنا تھا، یعنی اللہ تعالیٰ حضرت محمد ﷺ کے قول کے مطابق فقیر اور مفلس ہے، کیوں کہ اس نے ہم سے قرض کا مطالبہ کیا ہے۔۲۲

## اللہ کے محبوب ہونے کا زعم

نسلی تفاخر یہود کی فطرت میں داخل ہے۔ وہ کہتے تھے کہ ہم اللہ کے بیٹے اور چہیتے ہیں۔ قرآن کریم نے ان کے اس زعم کی تصویر کشی درج آیت میں کی ہے:

وَ قَالَتِ الْیَهُوْدُ وَ النَّصٰرٰی نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ (المائدۃ:۱۸)

(اور کہا یہود و نصاریٰ نے کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں۔)

امام طبریؒ۲۳ اور علامہ قرطبیؒ۲۴ نے لکھا ہے کہ یہود و نصاریٰ کو جب اسلام کی دعوت دی جاتی تو وہ ازراہِ غرور کہا کرتے تھے: ''ہمیں اس دین کو قبول کرنے اور اس کے نبی پر ایمان لانے کی کیا ضرورت؟ ہم تو اللہ کے چہیتے اور محبوب ہیں۔'' ان کی اس غلط فہمی کا ازالہ یہ کہہ کر کیا گیا کہ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو تو تم پر عذابِ الٰہی کے بادل کیوں ہر وقت منڈلاتے رہتے ہیں؟ کہیں پیاروں اور دوستوں کو یوں ذلیل کیا جاتا ہے، جیسے تمہیں کیا جا رہا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا کہ تم بھی عام انسانوں کی طرح ہو۔ رحمت اور عذاب کا قانون، جو تمام لوگوں کے لیے مقرر ہے، وہی تم پر بھی کارفرما ہوگا۔ جو ایمان اور اخلاص سے اپنے آپ کو اس کی مغفرت کا اہل ثابت کرے گا وہ بخشا جائے گا اور جو انکار کرے گا وہ گرفتِ الٰہی کا شکار ہوگا۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے اس آیت کے ضمن میں لکھا ہے: ''یہاں 'نحن' سے مراد افراد نہیں، بلکہ قوم اور مجموعۂ افراد مراد ہیں۔''۲۵

اس طرح کی باتیں موجودہ بائبل میں بھی پائی جاتی ہیں۔کتاب خروج میں ہے:

''خداوند نے یوں فرمایا ہے کہ اسرائیل میرا بیٹا، بلکہ میرا پہلوٹھا ہے۔''۲۶

مزید اسی طرح باب استثنا میں ہے:

''تم خداوند اپنے خدا کے فرزند ہو۔''۲۷

ہوسیع میں بھی مذکور ہے:

''جب اسرائیل لڑکا تھا، میں نے اس کو عزیز رکھا اور اپنے بیٹے کو مصر سے بلایا۔''۲۸

جیوش انسائیکلوپیڈیا (Jewish Encyclopedia) میں بھی انہی عقائد کا ذکر ہے:

The Israelites are designated also the childern of the living God. (29)

## ذاتِ الٰہی کے بارے میں یہودی تصور

یہود نے اللہ تعالیٰ کو نہ صرف انسان کے مشابہ قرار دیا، بلکہ اس میں موجود ناقص صفات سے بھی اللہ کو متصف کر دیا۔ان میں سے کچھ صفات کا تذکرہ بائبل میں پایا جاتا ہے:

''سو آسمان اور زمین اور ان کے کل لشکر کا بنانا ختم ہوا اور خدا نے اپنے کام کو جسے وہ کرتا تھا، ساتویں دن ختم کیا اور اپنے سارے کام سے، جسے وہ کر رہا تھا، ساتویں دن فارغ ہوا۔''۳۰

اسی طرح تخلیقِ کائنات کے بارے میں یہودی تصور یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے بنانے میں تھک گیا، چنانچہ اس نے ساتویں دن آرام کیا۔قرآن کریم نے ان کے تمام خیالاتِ فاسدہ کی تردید کی ہے کہ تھکن اور سستی تو انسانوں کو لاحق ہوتی ہے۔اللہ کی ذات ان عیوب سے پاک ہے۔ارشادِ ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ (ق:۳۸)

(بے شک ہم نے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کو چھ دنوں میں پیدا کیا اور ہم کو کوئی تکان لاحق نہیں ہوئی۔)

خلاصہ یہ ہے کہ یہود شرک و بت پرستی کی لعنت سے اپنے آپ کو اس زمانہ میں بھی محفوظ نہ رکھ سکے تھے، جب اللہ کے جلیل القدر پیغمبر حضرت موسیٰؑ ان کے درمیان موجود تھے اور انھوں نے اللہ کی قدرت اور کارسازی کے نہایت عجیب وغریب واقعات کا مشاہدہ کیا تھا۔ بعد میں بھی ان کی یہ عادت نہیں بدلی اور الٰہی احکام سے روگردانی، انبیاء علیہم السلام کی نافرمانی اور شرک سے دل چسپی کا سلسلہ جاری رہا۔ قرآن مجید نے ان کے مشرکانہ اعمال وعقائد کا ذکر کر کے دکھایا ہے کہ وہ راہِ ہدایت اور توحید سے منحرف ہو کر کفر وشرک کی گم راہیوں میں پڑ گئے تھے۔ علامہ زمخشریؒ نے لکھا ہے:

بچھڑے کی محبت اور اس کی پرستش کی خواہش ان کے دلوں میں اس طرح سرایت کر گئی تھی جس طرح رنگ کپڑے میں سرایت کر جاتا ہے۔[۳۱]

قرآن کریم نے واضح طور پر بیان کر دیا ہے کہ جو قوم بت پرستی، حرص وبخل، بغض وعناد، تکبر، جھوٹ اور قبیح اعمال کی مرتکب ہوگی وہ کیسے اپنے حقیقی رب کو پہچانے گی اور کیسے وقت کے نبی پر کامل یقین رکھے گی۔ قرآن نے اس حقیقت کو صرف ایک جملہ میں آشکار کر دیا: وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ (الأنعام:۹۱) ''جس طرح اللہ کی قدر کرنی چاہیے تھی انہوں نے اس کی قدر نہیں کی۔''

## حواشی ومراجع


۱۔ مودودی، ابوالاعلیٰ، سیّد، تفہیم القرآن، لاہور: ترجمان القرآن، ۱۹۹۹ء، ج۳، ص:۸۹

۲۔ وہبہ زحیلی، التفسیر المنیر، بیروت: دار الفکر، ۱۴۱۲ھ، ج۵، ص:۸۱۔۷۹

۳۔ کتاب یشوع ۱۵:۲۴۔۱۴

۴۔ رازی، فخر الدین، مفاتیح الغیب، بیروت: دار الفکر، ۱۹۹۹ء، ج۵، ص:۳۵۲۔۳۵۳

۵۔ آلوسی، شہاب الدین، السید محمود بغدادی، روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، بیروت: دار المعرفہ، ۲۰۰۰ء، ج۵، ص:۷۵۰۔۷۵۱

۶۔ کتابِ خروج ۳۲:۴ ۷۔ کتابِ خروج ۳۲:۱

۸۔ ابن حزم، الفصل فی الملل والاھواء والنحل، بیروت: دار الکتب العلمیۃ، ۱۴۲۴ھ، ج۱، ص:۹۹

۹۔ حقانی، عبدالحق، فتح المنان، کراچی: میر محمد کتب خانہ، ج ۲، ص:۴۹۲

10. Jewish Encyclopedia, London:Oxford University Press, 2000, Vol:9, P:590

۱۱۔ طبری، ابن جریر، جامع البیان عن تأویل آیٔ القرآن، ج ۱۰، ص ۱۲۶

۱۲۔ بغوی، محمود، محمد بن حسین، معالم التنزیل، بیروت: دارالکتب والعلمیۃ ۲۰۰۴، ج ۴، ص:۲۴۰

۱۳۔ پانی پتی، ثناءاللہ، قاضی، تفسیر مظہری، کوئٹہ: مکتبہ رشیدیہ ۲۰۰۲ء، ج ۴، ص:۲۲۲

۱۴۔ جصاص، ابوبکر رازی، احکام القرآن، بیروت: دارالفکر، ۱۴۱۷ھ، ج ۳، ص:۱۰۳

۱۵۔ رازی، فخر الدین، مفاتیح الغیب، بیروت: دارالفکر ۱۳۹۸ھ، ج ۳، ص:۶۲۰

۱۶۔ کاندھلوی، محمد ادریس، مولانا، معارف القرآن، لاہور: مکتبہ الحرمین، ج ۳، ص:۴۱۴

۱۷۔ عبدالماجد دریابادی، تفسیر ماجدی، لاہور: پاک کمپنی، ۱۹۹۹ء، ص:۴۳۶، حاشیہ ۵۱

۱۸۔ مودودی، ابوالاعلیٰ، سیّد، مولانا، تفہیم القرآن، ج ۲، ص:۹۸۱

۹۔ ترمذی، ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ، جامع ترمذی، ابواب التفسیر القرآن، باب من سورۃ التوبہ، بیروت: دارالفکر، ۱۴۱۴ھ، رقم الحدیث ۳۰۹۵

۲۰۔ تقی الدین، ابن تیمیہ، الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح، مصر: المکتبۃ التجاریۃ، ۲۰۰۰ء، ج ۱، ص:۲۴۱

۲۱۔ ابن کثیر، عماد الدین، ابوالفداء، تفسیر القرآن العظیم، بیروت: دارالطیبۃ، ۱۹۹۸ء، ج ۱، ص:۵۹۹

۲۲۔ قرطبی، ابوعبداللہ محمد بن احمد، الجامع لاحکام القرآن، ج ۴، ص:۴۷۵، رازی، فخر الدین، مفاتیح الغیب، ج ۳، ص:۴۴۶

۲۳۔ طبری، ابن جریر، جامع البیان، ج ۶، ص:۱۹۷

۲۴۔ قرطبی، ابوعبداللہ محمد بن احمد، الجامع لاحکام القرآن، ج ۶، ص:۱۷۹

۲۵۔ دریابادی، عبدالماجد، تفسیر ماجدی، ص:۲۸۰۔۲۸۱

۲۶۔ کتابِ خروج ۴۔۲۲ ۲۷۔ سفر استثنا ۱۴:۱ ۲۸۔ ہوسیع ۱:۱۱

28- Jewish Encyclopedia, Vol:6, P:15

۲۹۔ کتاب پیدائش ۲:۲۰۱

۳۰۔ زمخشری، جاراللہ، ابوالقاسم محمود بن عمر، الکشاف عن حقائق التنزیل، بیروت: دارالفکر، ۱۹۹۹ء، ج ۱، ص:۲۹۷

فقہیات

# شرکتِ محدودہ (لمیٹیڈ کمپنی) کی شرعی حیثیت

مولانا اختر امام عادل قاسمی

'شرکت محدودہ' یا 'لمیٹیڈ کمپنی' مشترکہ کاروبار کی ایک نئی شکل ہے، ورنہ بذاتِ خود مشترکہ کاروبار کا تصور نیا نہیں ہے، فقہاء متقدمین کی کتابوں میں شرکت کی مختلف قسموں اور احکام کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔ لمیٹیڈ کمپنی اسی شرکت کی ایک جدید قسم ہے۔ اس کا پس منظر مولانا مفتی محمد تقی عثمانی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> ''یورپ میں صنعتی انقلاب رونما ہونے کے بعد سترہویں صدی کے آغاز میں بڑے بڑے کارخانوں وغیرہ کے قائم کرنے کے لیے جب عظیم سرمایہ کی ضرورت پڑنے لگی، جس کو کوئی شخص اکیلا یا چند افراد مل کر فراہم نہیں کر سکتے تھے، تو اس وقت عام لوگوں کی منتشر بچتیں یکجا کر کے ان سے اجتماعی فائدہ اٹھانے کے لیے کمپنی کا نظام رائج ہوا۔''[۱]

## شرکت اور کمپنی میں فرق

کمپنی کو شرکت کی جدید قسم ماننے کی وجہ یہ ہے کہ فقہاء نے شرکت کی جو چار قسمیں بیان کی ہیں اور مضاربت کو بھی شامل کر لیا جائے تو پانچ قسمیں ہو جاتی ہیں، ان میں سے کسی بھی قسم میں کمپنی پورے طور پر داخل نہیں ہے۔ بنیادی طور پر اشتراک ہونے کے باوجود دونوں کے تصور و عمل میں کافی فرق پایا جاتا ہے، مثلاً:

(۱) شرکت میں ہر شریک کاروبار کے جزوِ مشاع کا مالک ہوتا ہے، جب کہ کمپنی میں ایسا نہیں ہوتا۔ کمپنی کا خود مستقل قانونی وجود ہے، اس کو شخصِ قانونی یا شخصِ فرضی کہا جاتا ہے۔ حاملانِ حصص کو کمپنی کے اثاثوں میں حقِ ملکیت تو حاصل

ہوتا ہے، مگر حقِ تصرف نہیں۔ کمپنی تحلیل ہونے کے بعد اگر کمپنی کے اثاثوں کی تقسیم عمل میں آئے تو شرکاء کو ان کے متناسب حصہ کے مطابق اثاثہ ملے گا، مگر تحلیل سے قبل اس میں وہ کوئی تصرف نہیں کر سکتے۔ اسی بنا پر کسی حاملِ حصص کے مدیون ہونے کی صورت میں اگر اس کے سامان کی قرقی عمل میں آئے تو کمپنی میں اس کے حصے کا اثاثہ قرق نہیں کیا جا سکتا۔

(۲) شرکت میں کاروباری سلسلے میں کوئی دعویٰ ہو تو تمام شرکاء مدّعی یا مدّعا علیہ بنیں گے اور ہر ایک فرد اس کا ذمہ دار قرار پائے گا۔ اس کے برخلاف کمپنی کا خود مستقل قانونی وجود ہے، وہ خود مدعی یا مدعا علیہ بنے گی، دوسرے حاملان حصص پر ذاتی طور سے اس کی ذمہ داری نہیں آئے گی۔

(۳) شرکت میں کوئی شریک اپنا معاملہ فسخ کر کے سرمایہ نکالنا چاہے تو نکال سکتا ہے، جب کہ کمپنی سے سرمایہ نہیں نکالا جا سکتا، البتہ بازارِ حصص میں اس کے شیئرز فروخت کیے جا سکتے ہیں۔

(۴) شرکت میں عموماً ذمہ داری کاروبار کے اثاثوں تک محدود نہیں ہوتی، جب کہ کمپنی میں ذمہ داری محدود ہوتی ہے۔[۲]

## کمپنی کے بارے میں فقہاء کی آراء

انہی وجوہِ فرق کی بنا پر کمپنی کو مشارکت یا اس کے شیئرز کی خرید وفروخت کو شرکت کی معروف فقہی قسموں میں سے کسی قسم میں پورے طور پر داخل نہیں کیا جا سکتا اور اسی بنا پر اس کے جواز وعدم جواز اور تکییف فقہی کے بارے میں علماء کی رائیں مختلف ہوگئی ہیں:

(۱) ایک رائے یہ ہے کہ شرکت فقہاء کی ذکر کردہ پانچ قسموں میں منحصر ہے، اور کمپنی ان میں سے کسی خانے میں مکمل طور پر فٹ نہیں ہوتی، اس لیے یہ جائز نہیں ہے۔

(۲) اس کے بالمقابل علماء کا بڑا طبقہ یہ کہتا ہے کہ شرکت کی مذکورہ قسمیں

منصوص نہیں ہیں، بلکہ فقہاء نے اپنے زمانہ کی مروّجہ صورتوں کا استقراء کر کے بیان کی تھیں، اس لیے شرکت ان میں محصور نہیں ہے اور یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ ان کے علاوہ کوئی نئی قسم پیدا نہیں ہوسکتی اور نہ کسی فقیہ نے آج تک اس طرح کی کوئی بات کہی ہے، اس لیے اگر کسی نئی قسم کا تعامل جاری ہو اور شرکت کے اصولِ منصوصہ کی مخالفت لازم نہ آئے تو اس میں کوئی حرج نہیں، اس لیے کہ تجارتی معاملات اور قسموں کی بنیاد زیادہ تر عرف اور تعامل پر ہے اور یہ تعامل زمانے کے لحاظ سے مختلف ہوسکتا ہے۔ علامہ کاسانیؒ شرکتِ عنان کی تشریح کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں:

وَلَنَا أَنَّ النَّاسَ يَتَعَامَلُونَ بِهٰذَيْنِ النَّوْعَيْنِ فِي سَائِرِ الْأَعْصَارِ مِنْ غَيْرِ إِنْكَارٍ عَلَيْهِمْ مِنْ أَحَدٍ، وَقَالَ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ: لَا تَجْتَمِعُ أُمَّتِي عَلَى ضَلَالَةٍ [۳]

''ہماری دلیل یہ ہے کہ لوگ ہر دور میں بلا نکیر دونوں طریقوں پر معاملہ کرتے رہے ہیں۔ ارشادِ نبوی ہے: ''میری امت گم راہی پر جمع نہیں ہوسکتی۔''

اس لحاظ سے کمپنی معاملہ کی ایک نئی قسم ہے، جو عقد شرکت اور عقد اجارہ سے مرکب ہے۔

(۳) ایک رائے یہ ہے کہ یہ اولاً شرکتِ املاک ہے، پھر عقدِ اجارہ ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ حصص کے خریدار اور ابتدائی سرمایہ کار اپنے مال ملا کر اکٹھا کر لیتے ہیں اور یوں ان کے مال میں شرکت قائم ہوجاتی ہے، پھر ڈائرکٹرز کا چناؤ کیا جاتا ہے، جو اجرت اور بھتوں کے عوض میں اس مشترکہ سرمایہ پر کام کرتے ہیں اور نفع ہر ایک کے سرمایہ کے تناسب سے تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح سے یہ شرکت املاک ہے اور پھر شرکتِ عقد نہیں ہے، اجارہ ہے۔'' [۴]

لیکن اصطلاحی اعتبار سے کمپنی کو شرکتِ املاک قرار دینا درست معلوم نہیں ہوتا، اس لیے کہ شرکت املاک فقہی اصطلاح میں ایسی شرکت کو کہتے ہیں جس میں شرکاء کے اختیار و ارادہ کے بغیر اتفاقی طور پر سرمایہ میں شرکت قائم ہوجائے، باقاعدہ شرکت

کا معاملہ نہ کیا جائے، مثلاً چند رشتہ داروں کو کوئی مشترکہ مال وراثت میں مل جائے، یا چند لوگوں کو کوئی مشترکہ چیز بطور ہبہ حاصل ہوجائے وغیرہ، جب کہ کمپنی میں باقاعدہ شرکت کا معاملہ کیا جاتا ہے اور اس کے اصول وشرائط کی پاس داری کا عہد کیا جاتا ہے، اس لیے یہ شرکت املاک نہیں، بلکہ شرکت عقد ہے، گوکہ اس کی معروف قسموں میں سے کسی پر پوری طرح منطبق نہ ہو۔ الجوہرۃ النیّرۃ میں ہے:

الشَّرِكَةُ عَلَى ضَرْبَيْنِ: شَرِكَةِ أَمْلَاكٍ وَشَرِكَةِ عُقُودٍ؛ فَشَرِكَةُ الْأَمْلَاكِ: الْعَيْنُ يَرِثُهَا الرَّجُلَانِ، أَوْ يَشْتَرِيَانِهَا، لِأَنَّ هَذِهِ أَسْبَابُ الْمِلْكِ وَكَذَا مَا وُهِبَ لَهُمَا، أَوْ أُوصِيَ لَهُمَا بِهِ فَقَبِلَاهُ ،وَكَذَا إِذَا اخْتَلَطَ مَالُ كُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا بِمَالِ صَاحِبِهِ خَلْطًا لَا يَتَمَيَّزُ .(قَوْلُهُ: وَلَا يَجُوزُ لِأَحَدِهِمَا أَنْ يَتَصَرَّفَ فِي نَصِيبِ الْآخَرِ إِلَّا بِإِذْنِهِ وَكُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا فِي نَصِيبِ صَاحِبِهِ كَالْأَجْنَبِيِّ) لِأَنَّ تَصَرُّفَ الْإِنْسَانِ فِي مَالِ غَيْرِهِ لَا يَجُوزُ إِلَّا بِإِذْنٍ أَوْ وِلَايَةٍ .(قَوْلُهُ: وَالضَّرْبُ الثَّانِي) (شَرِكَةُ الْعُقُودِ) وَرُكْنُهَا الْإِيجَابُ، وَالْقَبُولُ وَهُوَ أَنْ يَقُولَ أَحَدُهُمَا: شَارَكْتُكَ فِي كَذَا وَيَقُولَ الْآخَرُ: قَبِلْتُ .(قَوْلُهُ: وَهِيَ عَلَى أَرْبَعَةِ أَوْجُهٍ: مُفَاوَضَةٍ وَعِنَانٍ وَشَرِكَةِ الصَّنَائِعِ وَشَرِكَةِ الْوُجُوهِ) وَفِي الْخُجَنْدِيِّ الشَّرِكَةُ عَلَى ثَلَاثَةِ أَوْجُهٍ: شَرِكَةٍ بِالْأَمْوَالِ وَشَرِكَةٍ بِالْأَعْمَالِ وَشَرِكَةٍ بِالْوُجُوهِ، وَكُلُّ وَاحِدٍ مِنْهَا عَلَى وَجْهَيْنِ: مُفَاوَضَةٍ وَعِنَانٍ۔[۵]

''شرکت کی دو قسمیں ہیں : شرکت املاک اور شرکت عقود۔ شرکت املاک یہ ہے کہ کسی سامان کے دو آدمی وارث ہوں، یا دو آدمی اس کو خریدیں۔ اس لیے کہ یہ اسباب ملک ہیں۔ اس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ کوئی چیز دو آدمیوں کو ہبہ کردی جائے، یا ان کے لیے وصیت کردی جائے اور وہ دونوں قبول کرلیں، یا دو اشخاص کے مال باہم اس طرح خلط ملط ہوجائیں کہ ان کے درمیان تمیز ممکن نہ ہو کہ کون کس کا مال ہے؟ دونوں شریکوں میں سے کسی کے لیے جائز نہیں ہے کہ

دوسرے کے حصے میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف کرے۔ ہر شریک دوسرے کے حصے کے حق میں اجنبی کی طرح ہے۔اس لیے کہ انسان کا تصرف دوسرے کے مال میں جائز نہیں ہے،الّا یہ کہ اسے اجازت حاصل ہو یاولایت، دوسری قسم شرکت عقو د ہے۔ اس کا رکن ایجاب وقبول ہے،یعنی ایک شخص کہے کہ اس کاروبار میں میں نے تجھے شریک کیا اوردوسرا شخص اسے قبول کرے۔ شرکت عقود کی چار قسمیں ہیں: شرکت مفاوضہ، شرکت عنان، شرکت صنائع اورشرکت وجوہ۔الجُندی میں ہے کہ شرکت کی تین قسمیں ہیں:شرکت اموال، شرکت اعمال اورشرکت وجوہ۔پھر ان تینوں میں سے ہر ایک کی دوقسمیں ہیں: مفاوضہ اورعنان۔''

(۴)اس باب میں سب سے متوازن نقطۂ نظر حکیم الامت حضرت تھانویؒ کا ہے،جس کوعصر حاضر کے زیادہ تر علماء نے قبول کیا ہے اورکئی علمی اداروں نے اس کی توثیق کی ہے۔حضرت تھانویؒ کے نزدیک کمپنی بنیادی طور پر شرکتِ عنان میں داخل ہے۔[۶] اگر چہ کہ اس میں بعض ایسی خصوصیات پائی جاتی ہیں جومعروف شرکتِ عنان میں نہیں ہیں ،لیکن ان کی وجہ سے عنان کی حقیقت تبدیل نہیں ہوتی۔وہ جداگانہ خصوصیات درج ذیل ہیں:

## کمپنی میں ڈائرکٹرس کے اختیارات اورمعاوضے

ا۔کمپنی ،جوایک شخص قانونی ہے، دیگرشیئرز ہولڈرس کے تعاون سے کاروبار کرتی ہے،جس میں خوداس کے ڈائریکٹرس کا بھی سرمایہ شامل ہوتا ہے۔اس طرح یہ شرکت عنان کی شکل بن جاتی ہے۔ البتہ محنت وعمل میں شیئرز ہولڈرس کی شرکت نہیں ہوتی۔ یہ کمپنی بذات خود کرتی ہے۔حاملانِ حصص کوصرف نفع ونقصان سے سروکار ہوتا ہے،اس کے انتظامی امور سے نہیں۔لیکن اس سے شرکت کے جواز پر کوئی فرق پڑتا ہے نہ عنان کی حقیقت تبدیل ہوتی ہے۔فقہاء کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ شرکاءعنان میں سے کوئی شریک اپنے عمل کے لیے دوسرے کو وکیل بنادے اورخودعمل سے دست بردار

ہو جائے تو اس کی اجازت ہے۔علامہ سمرقندیؒ نے لکھا ہے:

**ویجوز أن یشترط العمل علیهما بان اشترکا علی أن یبیعا ویشتریا علی أن ما رزق من ذلک فهو بینهما علی کذا، ویجوز أن یشترطا العمل علی أحدهما دون الآخر۔**[۷]

''اور دونوں شرکاء کے عمل کی شرط لگانا جائز ہے، بہ ایں طور کہ دونوں کاروبار میں شریک رہیں اور جو اللہ تعالیٰ عطا کرے وہ دونوں کے درمیان برابر تقسیم ہو، نیز یہ بھی جائز ہے کہ صرف ایک کے لیے عمل کی شرط لگائی جائے، دوسرے کے لیے نہیں۔''

نیز شرکاء کو یہ اجازت بھی ہوتی ہے کہ وہ تجارت کو فروغ دینے کے لیے اجرت پر ماہرین کی خدمات حاصل کریں:

**(ولشریک العنان والمفاوض أن یوکل ویبضع ویضارب ویودع ویستأجر علی العمل) لأن کل ذلک من أفعال التجّار۔**[۸]

''عنان اور مفاوضہ کے شریک کے لیے جائز ہے کہ کسی کو وکیل بنائے، یا سرمایہ بنانے کے لیے دے، مال کو مضاربت میں لگائے، امانت رکھے، یا کام کے لیے کسی اجرت پر رکھے۔اس لیے کہ یہ سب اعمال تجارت کا حصہ ہیں۔''

**قَوْلُهُ (وَلِكُلٍّ من شَرِيكَيْ الْعِنَانِ وَالْمُفَاوَضَةِ أَنْ يُبْضِعَ وَيَسْتَأْجِرَ وَيُودِعَ وَيُضَارِبَ وَيُوَكِّلَ) بَيَانٌ لِمَا لِكُلٍّ مِنْهُمَا أَنْ يَفْعَلَهُ أَمَّا الْبِضَاعَةُ فَلِأَنَّهَا مُعْتَادَةٌ فی عَقْدِ الشَّرِكَةِ ، وفی الْقَامُوسِ: الْبَاضِعُ الشَّرِيكُ وَالْجَمْعُ بَضْعٌ من بَضَعَ كَمَنَعَ بُضُوعًا . وَالْمُرَادُ هُنَا دَفْعُ الْمَالِ لِآخَرَ لِيَعْمَلَ فيه على أَنْ يَكُونَ الرِّبْحُ لِرَبِّ الْمَالِ وَلَا شَيْءَ لِلْعَامِلِ وَأَمَّا الِاسْتِئْجَارُ فَلِكَوْنِهِ مُعْتَادًا بين التُّجَّارِ ۔**[۹]

''عنان اور مفاوضہ کے ہر شریک کو اجازت ہے کہ مال کو سرمایہ کاری کے لیے دے، کوئی ملازم رکھے، مال مضاربت کے لیے دے اور وکیل

بنائے ، یہاں سے اس کا بیان شروع ہورہا ہے کہ دونوں شرکاء کو کن اعمال کی اجازت ہے، بضاعۃ (سرمایہ لگانے) کا تو عقد شرکت میں عام رواج ہے، قاموس میں ہے کہ باضع کے معنیٰ شریک کے ہیں اور اس کی جمع بضع ہے، بضع سے منع کے وزن پر۔ مراد یہاں یہ ہے کہ کسی کو مال کاروبار کے لیے دیا جائے ، تاکہ نفع رب المال کو ہو اور عامل کو کچھ نہ ملے۔ اجیر رکھنے کا بھی تاجروں کے یہاں رواج ہے۔''

چنانچہ کمپنی میں شرکاء کے مشورہ سے چند ماہرین کا انتخاب کیا جاتا ہے، جن کو ڈائرکٹرز کہا جاتا ہے۔ کمپنی کے تمام انتظامی معاملات ان کے سپرد ہوتے ہیں۔ عام لوگوں کو اس میں مداخلت کی اجازت نہیں ہوتی، جو خالص انتظامی چیز ہے، البتہ عموماً ان ڈائرکٹرز کا سرمایہ بھی کمپنی کے کاروبار میں شامل ہوتا ہے اور اس کے نفع ونقصان میں وہ بھی شریک ہوتے ہیں، لیکن انتظامی خدمات کے معاملے میں وہ اصلاً کمپنی کے ملازم ہوتے ہیں اور کمپنی ختم ہوجانے کی صورت میں ان کی تنخواہوں کی جواب دہی ذاتی طور پر شرکاء پر نہیں ہوتی اور نہ کمپنی کے غیر معمولی نقصانات کا ہرجانہ ذاتی طور پر ان ملازمین (یا ڈائرکٹرس) سے وصول کیا جاسکتا ہے۔

گوکہ شرکت کے ساتھ اجرت کا معاملہ فقہی طور پر قباحت سے خالی نہیں ہے، لیکن بعض مصالح کے تحت اس کو گوارا کیا جاتا ہے، اور اس کی وجہ سے شرکت باطل نہیں ہوتی اور اس سے جو منافع حاصل ہوتے ہیں وہ حلال وطیب ہیں:

(وَتَفْسُدُ إِنْ شَرَطَ لِأَحَدِهِمَا دَرَاهِمَ مُسَمَّاةً مِنْ الرِّبْحِ) لِأَنَّهُ شَرْطٌ يُوجِبُ انْقِطَاعَ الشِّرْكَةِ فِي بَعْضِ الْوُجُوهِ فَلَعَلَّهُ لَا يُخْرِجُ إِلَّا الْقَدْرَ الْمُسَمَّى لِأَحَدِهِمَا مِنْ الرِّبْحِ وَنَظِيرُهُ الْمُزَارَعَةُ عِنْدَ مَنْ يُجِيزُهَا–الشَّرْحُ–قَوْلُهُ فَلَعَلَّهُ لَا يُخْرِجُ إِلَّا الْقَدْرَ الْمُسَمَّى لِأَحَدِهِمَا مِنْ الرِّبْحِ) أَيْ وَهُوَ خِلَافُ مُقْتَضَى الشِّرْكَةِ لِأَنَّ مُقْتَضَاهَا الِاشْتِرَاكُ فِي الرِّبْحِ لَا اخْتِصَاصُ وَاحِدٍ مِنْهُمَا وَنَقَلَ فِي الْفَتَاوَى الصُّغْرَى عَنْ شَيْخِ الْإِسْلَامِ خُوَاهَرْ زَادَهْ أَنَّهُ ذَكَرَ فِي

أَوَّلِ الْمُضَارَبَةِ : الشَّرِكَاتُ لَا تَبْطُلُ بِالشُّرُوطِ الْفَاسِدَةِ ۔۱۰

اگر کسی ایک شریک کے لیے نفع میں سے مقررہ رقم کی شرط لگادی تو شرکت فاسد ہوجائے گی،اس لیے کہ یہ ایسی شرط ہے جو بعض شکلوں میں شرکت کو ختم کردیتی ہے،کیوں کہ ممکن ہے کہ کل نفع ہی اتنا ہو جتنی مقررہ رقم کی شکل میں ایک شریک کے لیے شرط لگائی گئی ہے۔اس کی نظیر مزارعت ہے۔ان حضرات کے مطابق جو اس کو جائز کہتے ہیں۔

شرح: اس لیے کہ یہ شرکت کے مقتضیٰ کے خلاف ہے۔شرکت کا مطلب ہے دونوں شریک کی نفع میں شرکت، نہ کہ ایک فرد کے لیے نفع کو خاص کرنا،الفتاوی الصغریٰ میں شیخ الاسلام خواہرزادہ کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے کہ مضاربت کی بحث کی ابتدا میں یہ بات ذکر کی گئی ہے کہ شرکت شروط فاسدہ سے باطل نہیں ہوتی۔

قال فی الْفَتَاوَی الصُّغْرَی وَذَکَرَ خواهر زاده فی أَوَّلِ الْمُضَارَبَةِ : الشَّرِكَاتُ لَا تَبْطُلُ بِالشُّرُوطِ الْفَاسِدَةِ ، لِأَنَّ فيها مَعْنَى الْوَكَالَةِ وَالْوَكَالَاتُ لَا تَبْطُلُ بِالشُّرُوطِ۔۱۱

''الفتاوی الصغریٰ میں ہے کہ شیخ الاسلام خواہرزادہ نے مضاربت کی بحث کی ابتداء میں ذکر کیا ہے کہ شرکت شروط فاسدہ سے باطل نہیں ہوتی ،اس لیے اس میں وکالت کا معنیٰ پایا جاتا ہے۔اور وکالت شرطوں سے باطل نہیں ہوتی۔''

ان ڈائرکٹرز کی بنیادی تنخواہیں طے ہوتی ہیں،جو کمپنی کے منافع سے الگ ہوتی ہیں اور یہ بالعموم شرکاء کے علم میں ہوتی ہیں،البتہ بعض اضافی معاوضات ،جو کبھی تنخواہوں سے بھی متجاوز ہوتے ہیں،ان کی تفصیلات عام شرکاء کو معلوم نہیں ہوتیں،لیکن وہ بھی کمپنی کے مقررہ ضابطوں کے اندر ہی ہوتے ہیں اور کسی شریک کو عموماً اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ اس لیے فی الجملہ یہ ایسی جہالت نہیں ہے جس سے نزاع یا فساد پیدا ہو اور اصل باعثِ فساد چیز نزاع ہی ہے۔بعض حضرات کا خیال ہے کہ اصلاً یہ جہالت باعث نزاع ہے،لیکن کمپنی کے ضابطوں کی بنا پر شرکاء مجبور ہوتے ہیں، بہر حال نظام

اورقاعدہ قانون کے جبر ہی سے سہی۔ اتنی بات تو تسلیم شدہ ہے کہ فی الجملہ جہالت کے باوجود ان معاملات میں عملاً کسی قسم کا نزاع پیدا نہیں ہوتا اور فقہاء کی تصریحات کے مطابق جب تک جہالت کی بنیاد پر منازعت واقع نہ ہو، شرکت عنان فاسد نہیں ہوتی۔ علامہ کاسانیؒ لکھتے ہیں:

(وَلَنَا) أَنَّ الْجَهَالَةَ لَا تَمْنَعُ جَوَازَ الْعَقْدِ لِعَيْنِهَا بَلْ لِإِفْضَائِهَا إِلَى الْمُنَازَعَةِ ۔[۱۲]

''ہماری دلیل یہ ہے کہ جہالت جوازِ عقد کے لیے بذات خود مانع نہیں ہے، بلکہ سببِ نزاع ہونے کی بنا پر مانع بنتا ہے۔''

## شریعتِ اسلامیہ میں شخصِ قانونی کی بنیادیں

ا۔ کمپنی کی دوسری خصوصیت اس کا مستقل قانونی وجود ہے۔ یہ کسی مشترک کاروبار کے لیے ایک نیا تصور ہے، جو حال کی صدیوں میں پیدا ہوا ہے۔ شریعت اسلامیہ میں واضح طور پر یہ اصطلاح نہیں ملتی، البتہ اس کے نظائر ضرور ملتے ہیں، مثلاً:

### وقف

ا۔ اس کے لیے اگرچہ شخص قانونی کی اصطلاح استعمال نہیں کی گئی ہے، مگر وقف کا مستقل وجود تسلیم کیا گیا ہے۔ اس کی اپنی ملکیت ہوتی ہے، ملازمین کی تنخواہیں اس کے ذمہ ہوتی ہیں، وہ دائن و مدیون اور مدعی و مدعیٰ علیہ بن سکتا ہے، وہ اجیر رکھ سکتا ہے، جب کہ یہ سارے اوصاف شخص کے ہیں، اس سے فی الجملہ شخصِ قانونی کا تصور ثابت ہوتا ہے۔ فقہاء حنفیہ اور شافعیہ دونوں کے یہاں اس طرح کی صراحتیں موجود ہیں:

ليس للمتولّى أن يستدين على الوقف للعمارة إلا بإذن القاضى.....لو آجر القيّم ثم عزل فقبض الأجرة للمنصوب فى الأصحّ ۔[۱۳]

''متولی کے لیے جائز نہیں ہے کہ وقف کے نام پر اس کی تعمیر کے لیے

قرض لے، الّا یہ کہ قاضی سے اس کی اجازت لے لی جائے۔اگر نگران وقف نے کسی کو اجرت پر رکھا، پھر وہ معزول کر دیا گیا، تو اجرت پر قبضہ کا حق زیادہ صحیح قول کے مطابق اس عہدہ پر نئے مقرر کردہ شخص کو ہوگا۔

وفی الْحَاوِی وَیَجُوزُ لِلْمُتَوَلِّی إِذَا احْتَاجَ إِلَی الْعِمَارَةِ أَنْ یَسْتَدِینَ علی الْوَقْفِ وَیَصْرِفَ ذلک فیها وَالْأَوْلَی أَنْ یَکُونَ بِإِذْنِ الْحَاکِمِ۔[۱۴]

''حاوی میں ہے کہ اگر وقف کی تعمیر ومرمت میں قرض لینے کی ضرورت ہوتو متولی کے لیے قرض لینا اوراس میں خرچ کرنا جائز ہے، البتہ بہتر یہ ہے کہ یہ حاکم کی اجازت سے ہو۔''

علامہ سیوطی شافعیؒ لکھتے ہیں:

وقف تعطّل ریعه وفیه إمام وغیره فهل یلزم الناظر أن یستدین علی الوقف ویعطیهم؟الجواب: لا یلزمه ذلک ۔[۱۵]

''کسی وقف کی آمدنی ختم ہوجائے اوروہاں امام وغیرہ کے اخراجات ہوں، تو کیا نگرانِ وقف کے لیے لازم ہے کہ وہ وقف کے لیے قرض لے اور ملازمین کو تنخواہیں دے؟ جواب یہ ہے کہ لازم نہیں ہے۔''

بعض فقہی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر واجبات کے معاملے میں وقف اورمتولی کے درمیان مقابلہ کی نوبت آئے تو وقف کے مقابلے میں متولی کی شخصیت کالعدم قرار پاتی ہے اورساری ذمہ داری وقف پر عائد ہوتی ہے، مثلاً کسی متولی نے وقف کی مرمت کا کام کرایا اوراجیر کی اجرت ادا کرنے سے قبل ہی وہ معزول کر دیا گیا، تو اس اجرت کی ادائیگی متولی کے ذمہ نہیں ہوگی، بلکہ وقف کے ذمہ ہوگی، جو اس کی طرف سے نیا متولی ادا کرے گا، جب کہ نیا متولی ابتداءً معاملہ میں شریک نہیں تھا۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فقہ اسلامی میں وقف کا خود اپنا وجود تسلیم کیا گیا ہے، جو اس کے ذی روح متولیان اور ذمہ داران سے مختلف ہے:

وفی الْقُنْیَةِ: أَجَّرَ الْقَیِّمُ ثُمَّ عُزِلَ وَنُصِّبَ قَیِّمٌ آخَرُ فَقِیلَ أَخْذُ الْأَجْرِ لِلْمَعْزُولِ، وَالْأَصَحُّ أَنَّهُ لِلْمَنْصُوبِ لِأَنَّ الْمَعْزُولَ أَجَّرَهَا لِلْوَقْفِ لَا لِنَفْسِهِ۔[۱۶]

''فقیہ میں ہے کہ نگران وقف نے کوئی اجارہ کا معاملہ کیا، پھر معزول کر دیا گیا، تو بعض علماء کی رائے ہے کہ اجرت لینے کا اختیار معزول شخص ہی کو ہوگا، لیکن زیادہ صحیح یہ ہے کہ یہ ذمہ داری نئے مقرر شدہ نگراں کی ہے، اس لیے کہ معزول شخص نے جو کچھ کیا تھا وقف کے لیے کیا تھا، نہ کہ اپنے لیے۔''

بظاہر یہ بات خلاف عقل لگتی ہے کہ وقف ایک بے جان وجود ہے، پھر وہ صاحبِ ذمہ کیسے ہوسکتا ہے؟ لیکن فقہاء نے اس ظاہری قیاس کو بہت پہلے ہی ضرورت کی بنا پر مسترد کر دیا ہے، ورنہ وقف سے متعلق بہت سے مسائل پیچیدگیوں کا شکار ہو جائیں گے۔ اس طرح ضرورت کی بنا پر ہی سہی، فقہاء نے وقف کے جداگانہ وجود اور عملاً اس کے صاحب ذمہ ہونے کو تسلیم کیا ہے اور دیون اور دیگر واجبات کو وقف کے ذمہ قرار دیا ہے، ذی روح متولیان کے ذمہ نہیں۔ علامہ ابن نجیم لکھتے ہیں:

الرَّابِعَةُ فی الِاسْتِدَانَةِ لِأَجْلِ الْعِمَارَةِ حَيْثُ لم يَكُنْ غَلَّةٌ، قال فی الذَّخِيرَةِ، قال هِلَالٌ: إذَا احْتَاجَتْ الصَّدَقَةُ إلَى الْعِمَارَةِ وَلَيْسَ فی يَدِ الْقَيِّمِ ما يُعَمِّرُهَا فَلَيْسَ له أَنْ يَسْتَدِينَ عليها لِأَنَّ الدَّيْنَ لَا يَجِبُ ابْتِدَاءً إلَّا فی الذِّمَّةِ وَلَيْسَ لِلْوَقْفِ ذِمَّةٌ، وَالْفُقَرَاءُ وَإِنْ كانت لهم ذِمَّةٌ إلَّا أَنَّهُمْ لِكَثْرَتِهِمْ لَا تُتَصَوَّرُ مُطَالَبَتُهُمْ فَلَا يَثْبُتُ الدَّيْنُ بِاسْتِدَانَةِ الْقَيِّمِ إلَّا عليه ، وَدَيْنٌ يَجِبُ عليه لَا يَمْلِكُ قَضَاءَهُ من غَلَّةٍ هِيَ على الْفُقَرَاءِ، وَعَنْ الْفَقِيهِ أبی جَعْفَرٍ أَنَّ الْقِيَاسَ هذا لَكِنْ يُتْرَكُ الْقِيَاسُ فِيمَا فيه ضَرُورَةٌ نَحْوُ أَنْ يَكُونَ فی أَرْضِ الْوَقْفِ زَرْعٌ يَأْكُلُهُ الْجَرَادُ وَيَحْتَاجُ إلَى النَّفَقَةِ لِجَمْعِ الزَّرْعِ أو طَالَبَهُ السُّلْطَانُ بِالْخَرَاجِ جَازَ له الِاسْتِدَانَةُ، لِأَنَّ الْقِيَاسَ يُتْرَكُ لِلضَّرُورَةِ قال وَالْأَحْوَطُ فی هذه الصُّورَةِ كَوْنُهَا بِأَمْرِ الْحَاكِمِ لِأَنَّ وِلَايَةَ الْحَاكِمِ أَعَمُّ فی مَصَالِحِ الْمُسْلِمِينَ من وِلَايَتِهِ إلَّا أَنْ يَكُونَ بَعِيدًا عن الْحَاكِمِ وَلَا يُمْكِنُهُ الْحُضُورُ فَلَا بَأْسَ بِأَنْ يَسْتَدِينَ بِنَفْسِهِ۔[۱۷]

''چوتھی صورت یہ ہے کہ آمدنی نہ ہونے کی صورت میں تعمیر ومرمت کے لیے قرض لیا جائے، تو ذخیرہ میں ہے کہ ہلال فرماتے ہیں کہ اگر وقف و

صدقہ کی جائیداد کو مرمت کی ضرورت ہو اور متولی کے پاس تعمیر کا خرچ موجود نہ ہو تو اس کے لیے قرض لینا جائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ قرض ابتداءً ذمہ میں واجب ہوتا ہے اور وقف کے پاس ذمہ نہیں ہے۔ فقراء اگر چہ اصحاب ذمہ ہیں، لیکن کثرتِ تعداد کی بناپر ان کی طرف سے مطالبہ کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ پس متولی کے قرض لینے کی صورت میں اس کی ادائیگی کی ذمہ داری خود اسی کے سر ہوگی، اس کو فقراء کے لیے ہونے والی آمدنی سے ادا نہیں کیا جائے گا۔ فقیہ ابوجعفر سے منقول ہے کہ قیاس تو یہی ہے، لیکن قیاس کو وقتِ ضرورت چھوڑ دیا جاتا ہے۔ مثلاً کی وقف کی زمین میں کاشت ہوئی، لیکن ٹڈیوں نے کھالیا اور اب کھیتی جمع کرنے کے لیے خرچ کی ضرورت ہے، یا سلطان نے خراج کا مطالبہ کیا، ان صورتوں میں قرض لینا جائز ہے۔ اس لیے کہ قیاس ضرورت کے وقت چھوڑ دیا جاتا ہے، البتہ احتیاط اس صورت میں یہ کہ قرض لینے کی کاروائی حاکم کی اجازت سے ہو، اس لیے کہ مسلمانوں کے عمومی مفادات میں حاکم کی ولایت کا دائرہ متولی کی ولایت سے زیادہ وسیع ہے، الّا یہ کہ حاکم بہت دور ہو اور وہاں تک رسائی ممکن نہ ہو، ایسی صورت میں خود بھی قرض لینے کی اجازت ہے۔''

## بیت المال

۲۔ بیت المال سے پوری قوم کا حق متعلق ہوتا ہے، مگر کوئی اس کے مال کی ملکیت کا دعویٰ نہیں کرسکتا، اس کے تمام مال کا مالک خود بیت المال ہوتا ہے۔ بیت المال دائن و مدیون بھی بن سکتا ہے، بلکہ علماء کے مطابق بیت المال کے مختلف شعبے بھی اپنی اپنی جگہ شخص کا درجہ رکھتے ہیں۔ ایک شعبہ سے دوسرے شعبہ میں قرض لیا جا سکتا ہے۔ اس طرح جس شعبہ سے قرض لیا گیا ہے، وہ دائن ہوگا، اور جس کے لیے لیا گیا ہے، وہ مدیون ہوگا:

وَعَلَى الْإِمَامِ أَنْ يَجْعَلَ لِكُلِّ نَوْعٍ مِنْ هَذِهِ الْأَنْوَاعِ بَيْتًا يَخُصُّهُ وَلَا يَخْلِطُ بَعْضَهُ بِبَعْضٍ، لِأَنَّ لِكُلِّ نَوْعٍ حُكْمًا يَخْتَصُّ بِهِ فَإِنْ لَمْ يَكُنْ

فِی بَعْضِهَا شَیْءٌ ، فَلِلْإِمَامِ أَنْ یَسْتَقْرِضَ عَلَیْهِ مِنَ النَّوْعِ الْآخَرِ وَیَصْرِفُهُ إِلَی أَهْلِ ذَلِکَ، ثُمَّ إِذَا حَصَلَ مِنْ ذَلِکَ النَّوْعِ شَیْءٌ رَدَّهُ فِی الْمُسْتَقْرَضِ مِنْهُ۔۱۸

''امام وقت کی ذمہ داری ہے کہ بیت المال کے ہر شعبہ کو الگ الگ رکھے، ایک دوسرے سے خلط ملط نہ کرے، اس لیے کہ ہر نوع کا الگ حکم ہے۔ البتہ اگر کسی ایک شعبہ میں آمدنی نہ ہو تو امام کے لیے دوسرے شعبہ سے قرض لینے اور اس میں خرچ کرنے کی اجازت ہے، پھر جب اس شعبہ میں آمدنی آجائے تو متعلقہ شعبہ کو قرض لوٹا دے۔''

وعلی الامام أن یجعل لکل نوع بیتاً یخصّه ،وله أن یستقرض من أحدها لیصرفه للآخر ویعطی بقدر الحاجة والفقه والفضل، فإن قصر کان اللّٰه علیه حسیباً۔۱۹

''امام وقت کی ذمہ داری ہے کہ بیت المال کے ہر شعبہ کو الگ الگ رکھے اور اس کے لیے ایک شعبہ کے اخراجات کے لیے دوسرے شعبہ سے بقدر ضرورت قرض لینا درست ہے۔ اگر اس باب میں کوتاہی ہو تو اللہ تعالیٰ حساب لینے والا ہے۔''

وقال الشرنبلالی فی رسالته: ذکروا أنه یجب علیه أن یجعل لکل نوع منها بیتاً یخصّه ولا یخلط بعضه ببعض ، وأنه إذا احتاج إلی مصرف خزانة ولیس فیها ما یفی به یستقرض من خزانة غیرها، ثم إذا حصل للتی استقرض لها مال یرد إلی المستقرض منها۔۲۰

''علامہ شرنبلالی نے اپنے رسالے میں لکھا ہے: فقہاء نے ذکر کیا ہے کہ امام کی ذمہ داری ہے کہ ہر مد کا الگ گھر بنائے اور ایک دوسرے میں خلط ملط نہ کرے، البتہ اگر کبھی کسی خزانہ میں بقدر ضرورت آمدنی نہ ہو تو دوسرے خزانے سے قرض لے سکتا ہے، پھر جب آمدنی آجائے تو یہ قرض متعلقہ خزانہ کو واپس کر دے۔''

وَعَلَی الْإِمَامِ أَنْ یَجْعَلَ لِکُلِّ نَوْعٍ مِنْ هَذِهِ الْأَنْوَاعِ بَیْتًا یَخُصُّهُ وَلَا

يَخْلِطُ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ وَيَسْتَقْرِضُ مِنْ بَعْضِهَا لِبَعْضٍ عِنْدَ الْحَاجَةِ إِلَيْهِ ثُمَّ يَرُدُّهُ إِذَا حَصَلَ۔[۲۱]

''امام کی ذمہ داری ہے کہ ہر مد کا الگ گھر بنائے اور ایک دوسرے میں خلط ملط نہ کرے، البتہ اگر کبھی کسی شعبہ میں بقدر ضرورت آمدنی نہ ہو تو دوسرے شعبہ سے قرض لے لے، پھر جب آمدنی آجائے تو یہ قرض متعلقہ خزانہ کو واپس کردے۔''

## نظیر کا مطلب

واضح رہے کہ یہ نظائر ہیں اور ہمیشہ جس مسئلہ کو نظیر بنایا جاتا ہے اس پر انطباق کامل مطلوب نہیں ہوتا، بلکہ صرف قدرِ مشترک کی حد تک انطباق کافی ہوتا ہے، مثلاً کسی انسان کو شیر کہا جائے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ وہ کامل طور پر انسان کے بجائے شیر ہی ہو، بلکہ صرف قدر مشترک شجاعت میں تشبیہ دینا مقصود ہوتا ہے۔ اسی طرح وقف یا بیت المال کی مثالوں سے صرف یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ کبھی شریعت میں مجموعۂ افراد بھی فرد معنوی کا درجہ حاصل کرلیتا ہے، نحو اور اصول فقہ میں بھی فرد حقیقی اور فرد معنوی کی تقسیم ملتی ہے، کسی نوع یا جنس کے مجموعہ کو فرد معنوی کا درجہ دیا گیا ہے، جس میں حقوق وذمہ داریاں تمام تر ارکان جماعت کے بجائے مجموعہ پر عائد ہوتی ہیں، جو حقوق مجموعہ سے وابستہ ہوں وہ ارکان جماعت پر الگ الگ عائد نہیں کیے جاسکتے اور جو واجبات وقف یا بیت المال سے وابستہ ہیں ان کی ذمہ داری بحیثیت فرد ذاتی طور پر اس کے متولی یا نگراں پر عائد نہیں ہوتی۔ متعلقہ واجبات اور ذمہ داریاں وقف یا بیت المال کی ہیئت مالیہ پر عائد ہوتی ہیں۔ اگر واجبات کی مقدار وقف یا بیت المال کی صلاحیت سے فزوں تر ہو تو متولی اور نگراں ذاتی طور ان کی ادائیگی کے پابند نہیں ہیں اور بحیثیت متولی ونگراں وقف اور بیت المال کی تمام تر جواب دہی کے باوجود اس کی ذمہ داریاں وقف اور بیت المال کی مالی صلاحیت تک محدود ہوتی ہیں، گو کہ وہ وقف یا بیت المال کے خود بھی تنخواہ دار ہوں۔

بعض حضرات سمجھتے ہیں کہ وقف اور بیت المال چوں کہ بے حس اور بے جان چیزیں ہیں، اس لیے شریعت نے ان کا نگراں یا متولی مقرر کیا ہے اور اصلاً تمام جواب دہی اسی متولی یا نگراں کے ذمہ ہے، لیکن چوں کہ متولی یا نگراں کا کوئی مفاد اس وقف یا بیت المال سے وابستہ نہیں ہے اور اس میں اس کا سرمایہ شامل نہیں ہے، اس لیے اس کی ذمہ داریاں محدود کردی گئی ہیں۔۲۲ لیکن یہ توجیہ حقیقت پر مبنی نہیں ہے، اس لیے کہ اوپر عرض کیا جاچکا ہے کہ شریعت اسلامیہ نے ضرورت کی بنیاد پر خود وقف کو ہی عملاً صاحبِ ذمہ تسلیم کیا ہے اور اس کے واجبات سے اس کے ذی روح اور جان دار متولیان کو بری الذمہ کردیا ہے، بلکہ اس بے روح وقف یا بیت المال کے بالمقابل ذی روح متولیان کی شخصیات کو منعدم قرار دیا ہے۔ اس لیے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وقف یا بیت المال سے متولی یا نگراں کا مفاد وابستہ ہے یا نہیں۔ اگر وقف یا بیت المال کا نگراں تنخواہ دار بھی ہو اور دیگر منافع بھی ان سے حاصل کرے، تب بھی اس کی ذمہ داریاں محدود ہی رہتی ہیں۔ یہاں ہمیں صرف اس قدرِ مشترک پر نگاہ رکھنی چاہئے اور شریعت کے مزاج کو سمجھنا چاہیے کہ اگر بعض حالات میں عرف عام یا ملکی یا بین الاقوامی قانون کسی مجموعہ کو فرد معنوی یا شخص قانونی کا درجہ دے تو شریعت اسلامیہ اس کی نفی نہیں کرتی، بلکہ اسلامی قانون میں فی الجملہ اس کی بنیادیں موجود ہیں۔۲۳

## ترکہ مستغرقہ بالدین

۳۔ جو شخص اس حالت میں فوت ہو جائے کہ اس کا پورا ترکہ اس کے دین میں غرق ہو جائے تو ایسے شخص کا ترکہ خود اپنا وجود رکھتا ہے اور وہ ترکہ خود مدیون ہے، اسی سے قرض ادا کیا جائے گا، میت مدیون نہیں ہے اس لیے کہ اب وہ مکلّف و اہل نہیں اور نہ ورثہ مدیون قرار پائیں گے۔ اس سے شخصِ قانونی ثبوت ملتا ہے:

(قَوْلُهُ أَلَا تَرَى أَنَّ التَّرِكَةَ لَوْ هَلَكَتْ إلَخْ) وَفِي فَتَاوَى رَشِيدِ الدِّينِ

إِذَا كَانَتُ التَّرِكَةُ مُسْتَغْرَقَةً بِالدَّيْنِ فَأَرَادَ الْوَارِثُ اسْتِخْلَاصَ التَّرِكَةِ وَنَقْدَ الْمَالِ يُجْبَرُ رَبُّ الدَّيْنِ عَلَى الْقَبُولِ لِأَنَّ عِنْدَ اسْتِغْرَاقِ التَّرِكَةِ بِالدَّيْنِ وَإِنْ كَانَ لَا مِلْكَ لَهُمْ وَلَكِنْ لَهُمْ حَقُّ اسْتِخْلَاصِ التَّرِكَةِ ، أَمَّا لَوْ قَالُوا نَحْنُ نُؤَدِّي الدَّيْنَ وَلَمْ يَكُنْ الْمَالُ نَقْدًا كَانَ لِلْقَاضِي أَنْ يَبِيعَ التَّرِكَةَ وَيَقْضِيَ حَقَّ الْغُرَمَاءِ، وَالْأَجْنَبِيُّ لَوْ نَقَدَ الدَّيْنَ لَا يُجْبَرُ رَبُّ الدَّيْنِ عَلَى الْقَبُولِ .لِأَنَّهُ لَيْسَ لَهُ وِلَايَةُ اسْتِخْلَاصِ التَّرِكَةِ بِخِلَافِ الْوَرَثَةِ وَالدَّيْنُ إِذَا كَانَ زَائِدًا عَلَى التَّرِكَةِ فَلِلْوَرَثَةِ وِلَايَةُ اسْتِخْلَاصِ التَّرِكَةِ بِأَدَاءِ جَمِيعِ الدَّيْنِ لَا بِقَدْرِ التَّرِكَةِ كَالْعَبْدِ الْجَانِي إِذَا فَدَاهُ الْمَوْلَى فَدَاهُ بِأَرْشِهِ ۲۴

''کیا تم نہیں دیکھتے کہ ترکہ اگر ہلاک ہوجائے الخ : فتاویٰ رشیدالدین میں ہے کہ اگر ترکہ دین میں مستغرق ہوجائے اوروارث ترکہ کے استخلاص اورنقدمال دینے کاارادہ کریں تو قرض والے کوقبول کرنے پر مجبورکیاجائے گا۔اس لیے کہ ترکہ کے دین میں مستغرق ہونے کی صورت میں گوکہ ورثہ کوترکہ کی ملکیت حاصل نہیں ہے ،لیکن ترکہ کے استخلاص کاحق ان کو بہرحال حاصل ہے۔اگر وہ کہیں کہ ہم قرض ادا کریں گےاور مال نقد نہ ہوتو قاضی کے لیےترکہ کو بیچ کرقرض خواہوں کا حق اداکرناجائز ہے۔لیکن ورثہ کے علاوہ کوئی اجنبی شخص نقد دین ادا کرناچاہے تو قرض والوں کو قبول کرنے پر مجبورنہیں کیاجائے گا،اس لیے کہ اس کوترکہ کے استخلاص کاحق حاصل نہیں ہے،بخلاف ورثہ کے، اوراگر قرض ترکہ سے زائد ہوتواستخلاص ترکہ کے لیے ورثہ کومکمل قرض اداکرناہوگا،صرف بقدر ترکہ نہیں،جیسے کہ جنایت کرنے والے غلام کافدیہ مولیٰ پوری جنایت کے بقدراداکرتاہے۔''

بِخِلَافِ ما إِذَا مَاتَ الرَّجُلُ وَتَرَكَ عَبْدًا وَتَرِكَتُهُ مُسْتَغْرَقَةٌ بِالدَّيْنِ فَأَعْتَقَهُ الْوَارِثُ ثُمَّ سَقَطَ دَيْنُ الْغُرَمَاءِ فإنه يَنْفُذُ إِعْتَاقُ الْوَارِثِ، لِأَنَّ ثَمَّةَ سَبَبَ الْمِلْكِ لِلْوَارِثِ تَامٌّ وَإِنَّمَا تَوَقَّفَ الْمِلْكُ لِحَقِّ الْغُرَمَاءِ فإذا سَقَطَ حَقُّ الْغُرَمَاءِ فإن إِعْتَاقَ الْوَارِثِ يَنْفُذُ ۔۲۵

''بہ خلاف اس صورت کے کہ جب آدمی مر جائے اور ایک غلام چھوڑے اور اس کا ترکہ دین میں مستغرق ہو پس غلام کو وارث نے آزاد کر دیا، پھر قرض خواہوں کا دین ساقط ہو گیا تو وارث کا اعتاق نافذ ہو جائے گا، اس لیے کہ یہاں وارث کے لیے سبب ملک مکمل موجود ہے، محض حق غرماء کی وجہ سے ملکیت موقوف ہو گئی تھی، لیکن جیسے قرض خواہوں کا حق ساقط ہوا، وارث کا اعتاق نافذ ہو گیا۔''

**سئل برهان الدين عمّن مات مفلساً وعليه دين فتبرّع إنسان بقضاء دينه ،هل يسقط دينه؟ قال: لا، لأن إسقاط الساقط لا يتصور لأنه سقط بموته مفلساً ولا يبطل حق المطالبة في الآخرة۔**[۲۶]

''شیخ برہان الدین سے اس شخص کے بارے میں سوال کیا گیا جس کی مفلسی کی حالت میں موت ہوئی اور اس پر بہت سے قرض ہیں، اگر کوئی انسان از راہ تبرع اپنے طور پر اس قرض کو ادا کر دے تو کیا اس کا قرض ساقط ہو جائے گا؟ شیخ نے جواب دیا: نہیں۔ اس لیے کہ ساقط کو ساقط کرنے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ حالت مفلسی کی موت سے اس کا قرض خود ساقط ہو چکا ہے اور آخرت کا حق مطالبہ باطل نہیں ہوگا۔''

**وَلَوْ كَانَ عَلَى الْمَيِّتِ دَيْنٌ يُحِيطُ بِمَالِهِ وَلَمْ يُوصِ إلَى أَحَدٍ فَدَفَعَهُ الْوَكِيلُ إلَى غُرَمَائِهِ أَوْ إلَى الْوَرَثَةِ؛ لَا يَبْرَأُ، لِأَنَّ الْمَقْصُودَ لَا يَحْصُلُ بِالدَّفْعِ إلَيْهِمْ، فَإِنَّ الْغُرَمَاءَ لَا يَتَمَكَّنُونَ مِنْ الْخُصُومَةِ مَعَهُ وَالْوَرَثَةُ كَالْأَجَانِبِ إذَا كَانَتْ التَّرِكَةُ مُسْتَغْرَقَةً بِالدَّيْنِ ۔**[۲۷]

''اگر میت پر اتنا قرض ہو جو اس کے پورے مال کو محیط ہو اور اس نے کسی کو وصیت نہ کی ہو، پھر وکیل نے اس کے قرض خواہوں یا ورثہ کو مال دے دیا تو بری نہیں ہوگا۔ اس کہ مقصود ان کو دینے سے حاصل نہیں ہوتا، کیوں کہ قرض خواہ وکیل کے فریق نہیں بن سکتے اور جب ترکہ دین میں مستغرق ہو جائے تو ورثہ اجنبیوں کے حکم میں ہو جاتے ہیں۔''

## خلطۃ الشیوع

۴۔ یہ نظیر فقہ حنفی کے مطابق نہیں، بلکہ ائمہ ثلاثہ کے مطابق ہے۔ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک اگر مال زکوٰۃ کئی شخصوں کے درمیان غیر ممیّز طور پر مشترک ہوتو زکوٰۃ الگ الگ شرکاء پر نہیں، بلکہ مجموعۂ مال پر واجب ہوتی ہے،یعنی الگ الگ شرکاء پر انفرادی طور پر، گوکہ زکوٰۃ واجب نہ ہو،لیکن اگر یہ مجموعۂ نصابِ زکوٰۃ تک پہنچتا ہوتواس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ گویا خود مجموع مال شخص کی حیثیت رکھتا ہے اورشرکاء اپنی ذاتی حیثیت میں منعدم قرار پاتے ہیں:

(وَلَوْ اشْتَرَکَ أَهْلُ الزَّکَاةِ) کَاثْنَیْنِ (فِی مَاشِیَةٍ) مِنْ جِنْسٍ بِإِرْثٍ أَوْ شِرَاءٍ أَوْ غَیْرِهِ، وَهِیَ نِصَابٌ أَوْ أَقَلُّ وَلِأَحَدِهِمَا نِصَابٌ فَأَکْثَرُ وَدَامَا عَلَی ذَلِکَ (زَکَّیَا کَرَجُلٍ) وَاحِدٍ؛ لِأَنَّ خُلْطَةَ الْجِوَارِ تُفِیدُ ذَلِکَ کَمَا سَیَأْتِی، فَخُلْطَةُ الْأَعْیَانِ بِطَرِیقِ الْأَوْلَی، وَهَذِهِ الشَّرِکَةُ قَدْ تُفِیدُهُمَا تَخْفِیفًا کَالِاشْتِرَاکِ فِی ثَمَانِینَ عَلَی السَّوَاءِ، أَوْ تَثْقِیلًا کَالِاشْتِرَاکِ فِی أَرْبَعِینَ أَوْ تَخْفِیفًا عَلَی أَحَدِهِمَا وَتَثْقِیلًا عَلَی الْآخَرِ کَأَنْ مَلَکَا سِتِّینَ لِأَحَدِهِمَا ثُلُثَاهَا وَلِلْآخَرِ ثُلُثُهَا۔[۲۸]

''اگراہلِ زکوٰۃ مثلاً دواشخاص کسی ایک جنس کے جانورمیں وراثت یاخرید کے ذریعہ شریک ہوجائیں اوروہ نصاب کے بقدرہوجائے، یاکم ہو اورایک کاحصہ نصاب کے بقدر یازائد ہواوراس شرکت پر دونوں قائم رہیں تو دونوں شخص واحد کی طرح زکوٰۃ ادا کریں گے۔اس لیے کہ خلطۃ الجوار بھی اس میں مفید ہے، جیسا کہ آگے آئے گا،پس خلطۃ الاعیان بدرجۂ اولیٰ مفید ہوگااور یہ شرکت کبھی شرکاء کوتخفیف کا فائدہ بھی دیتی ہے، جیسے اسّی(۸۰) جانوردوآدمیوں میں برابرطور پرمشترک ہوں، اورکبھی تثقیل بھی پیدا کرتی ہے،مثلاً چالیس میں دوآدمی شریک ہوں، یاایک کوتخفیف کا فائدہ دیتی ہے، دوسرے کوتثقیل میں ڈالتی ہے، مثلاً دواشخاص ساٹھ جانور کے مالک ہوں،ایک کادوثلث ہواوردوسرے کاایک ثلث۔''

وَمِثْلُهَا خُلْطَةُ الشُّيُوعِ بَلْ أَوْلَى وَالْخُلْطَةُ فِي الْمَاشِيَةِ قد تُوجِبُ زَكَاةً لَا تَجِبُ لَوْلَا الْخُلْطَةُ كَخُلْطَةِ عِشْرِينَ لِوَاحِدٍ بِمِثْلِهَا لِآخَرَ فَتَجِبُ شَاةٌ وَلَوْ انْفَرَدَ لم يَجِبْ شَيْءٌ وقد تُقَلِّلُهَا عَلَيْهِمَا كَأَرْبَعِينَ بِمِثْلِهَا فَتَجِبُ شَاةٌ وَلَوْ انْفَرَدَا وَجَبَ على كل شَاةٍ۔۲۹

''اسی طرح خلطۃ الشیوع کا حکم ہے، بلکہ یہ بدرجۂ اولیٰ، جانور میں اختلاط کبھی زکوٰۃ کو واجب کرتا ہے کہ اگر اختلاط نہ ہوتا تو زکوٰۃ واجب نہ ہوتی۔ مثلاً ایک شخص کے بیس جانور میں دوسرے آدمی کے بھی بیس ملادیا جائے تو ایک بکری واجب ہوجائے گی، جب کہ الگ الگ کچھ واجب نہیں اور کبھی یہ اختلاط شرکاء کے لیے تخفیف بھی پیدا کرتی ہے، مثلاً چالیس میں چالیس ملادیں تو ایک بکری واجب ہوگی ،جب کہ الگ الگ رہتے تو دونوں پر ایک ایک بکری واجب ہوتی۔''

## کمپنی میں محدود ذمہ داری کا مسئلہ

(۳) تیسری چیز جو کمپنی کو شرکت کی معروف قسموں سے ممتاز کرتی ہے وہ ہے محدود ذمہ داری کا معاملہ۔ مضاربت میں مسئلہ یہ ہے کہ اگر رب المال مضارب کو قرض لینے کی اجازت نہ دے تو مضارب پر دیون زیادہ ہو جانے کی صورت میں رب المال کی ذمہ داری محدود ہوتی ہے، البتہ قرض کی اجازت دے دینے کے بعد ذمہ داری محدود نہیں رہتی۔ کمپنی میں شیئرز ہولڈرز کی ذمہ داری محدود ہوتی ہے، جب کہ کمپنی اپنے کاروبار کے لیے قرض وغیرہ لیتی رہتی ہے۔ مگر اس کا حل یہ نکالا جا سکتا ہے کہ کمپنی کے پراسپکٹس میں لکھا ہوتا ہے کہ کمپنی کاروباری ضرورت سے قرض بھی لے گی، اس کے باوجود شیئرز ہولڈر کا شیئرز خریدنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ کمپنی کو قرض لینے کی اجازت دے رہا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ پراسپکٹس میں یہ بھی لکھا ہوتا ہے کہ شیئرز ہولڈر کی ذمہ داری محدود ہوگی، قرض کی اجازت دینے کے بعد ذمہ داری کے محدود ہونے کا کیا مطلب ہے؟ اس مشکل کا حل مولانا تقی عثمانی نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ شیئرز ہولڈر کا پراسپکٹس میں مرقوم دونوں باتیں دیکھتے ہوئے کمپنی کے ساتھ مشارکت کرنا اس بات کی علامت ہے کہ وہ کمپنی کو

قرض لینے کی اجازت اس شرط کے ساتھ دے رہا ہے کہ اس کی ذمہ داری محدود رہے گی، اس مضاربت کی طرح جس میں رب المال مضارب کو اس شرط کے ساتھ قرض لینے کی اجازت دے کہ اس کی ذمہ داری محدود رہے گی۔

لیکن یہاں ایک دشواری اور ہے، وہ یہ کہ مضاربت کی جس شکل میں رب المال کی ذمہ داری محدود ہوتی ہے، اس میں خود مضارب کی ذمہ داری غیر محدود ہوتی ہے اور تمام دیون کے ادا کرنے کا وہ ذمہ دار ہوتا ہے، چاہے کاروباری سرمایے سے ہو یا اپنی ذاتی اثاثے سے ہو، جب کہ کمپنی میں ایسا نہیں ہوتا۔ یہاں ایک طرف شیئرز ہولڈرز کی ذمہ داری محدود ہوتی ہے تو دوسری طرف کمپنی کے ڈائرکٹرز کی ذمہ داریاں بھی محدود ہوتی ہیں۔ اس صورت میں قرض دینے والوں کو سخت غرر یا ضرر کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے، جس کو فقہاء کی اصطلاح میں 'ذمہ کا خراب ہونا' کہتے ہیں:

> **وأما القسم الذی لیس للمضارب أن یعمله إلا بالتنصیص علیه فی المضاربة المطلقة، فلیس له أن یستدین علی مال المضاربة، ولو استدان لم یجز علی رب المال،ویکون دیناً علی المضارب فی ماله؛ لأن الاستدانة إثبات زیادة فی رأس المال من غیر رضا رب المال، بل فیه إثبات زیادة ضمان علی رب المال من غیر رضاه، لأن ثمن المشتری برأس المال فی باب المضاربة مضمون علی رب المال۔**[۳۰]
>
> ''جس قسم میں مضارب کو تصریح کے بغیر اپنی مرضی سے کسی عمل کی اجازت نہیں ہے، اس میں مضارب کے لیے مال مضاربت کے اوپر قرض لینے کی اجازت نہیں ہے اور اگر قرض لے تو اس کی جواب دہی رب المال پر نہیں ہوگی، بلکہ یہ قرض مضارب کے اپنے مال سے ادا کیا جائے گا۔ اس لیے کہ قرض لینا راس المال میں رب المال کی مرضی کے بغیر اضافہ کرنا ہے، بلکہ اس میں رب المال پر اس کی مرضی کے بغیر اضافی ضمان بھی عائد کرنا لازم آتا ہے، اس لیے کہ مضاربت کے باب میں راس المال

سے خریدے گئے سامان کی قیمت رب المال کے ذمہ ہوتی ہے۔''

**أنه لا يجوز من المضارب الاستدانة على رب المال يستوى فيه ما إذا قال رب المال: اعمل برأيک أو لم يقل، لأن قوله: اعمل برأيک تفويض إليه،فيما هو من المضاربة، والاستدانة لم تدخل فى عقد المضاربة، فلا يملكها المضارب إلا بإذن ربّ المال بها نصاً ، ثم كما لا يجوز للمضارب الاستدانة على مال المضاربة لا يجوز له الاستدانة على إصلاح مال المضاربة۔**[۳۱]

''مضارب کی طرف سے رب المال کے نام پر قرض لینا جائز نہیں ،خواہ اس میں رب المال نے یہ کہا ہو کہ اپنی رائے پر عمل کرو یا نہ کہا ہو،اس لیے کہ اپنی رائے پر عمل کرو کہنا دراصل مضاربت سے متعلق تمام تر ذمے داری اس کے حوالے کرنا ہے اور قرض لینا عقد مضاربت میں داخل نہیں ہے۔اس لیے ربّ المال کی صریح اجازت کے بغیر مضارب کو قرض لینے کا اختیار نہیں ہے، پھر جس طرح مضارب کے لیے مال مضاربت پر قرض لینا جائز نہیں ہے۔اسی طرح مال مضاربت کی اصلاح کے لیے بھی قرض لینا جائز نہیں ہے۔''

**وَلَا يَمْلِكُ الْمُضَارِبُ الْإِقْرَاضَ، وَالْهِبَةَ، وَالتَّصَدُّقَ، وَإِنْ قِيلَ لَهُ اعْمَلْ بِرَأْيِكَ بِلَا تَنْصِيصٍ۔**[۳۲]

''مضارب رب المال کی تصریح کے بغیر قرض دینے اور ہبہ یا صدقہ کرنے کا اختیار نہیں رکھتا،اگرچہ کہ اس سے کہا گیا ہو کہ اپنی رائے پر عمل کرو۔''

اسی لیے بعض علماء نے کمپنی میں محدود ذمہ داری کے تصور کو شرعاً غلط قرار دیا ہے۔ لیکن یہ پریشانی پیدا ہوتی ہے کمپنی کی حقیقی حیثیت کو سامنے نہ رکھنے کی وجہ سے، اگر کمپنی کو شخص قانونی تسلیم کر لیا جائے، جیسا کہ اس کی حیثیت عرفی یہی ہے اور ملکی اور بین الاقوامی قانون میں اس کا مستقل وجود تسلیم کیا گیا ہے اور خود شریعت اسلامیہ میں بھی فی الجملہ اس کی بنیادیں موجود ہیں، جیسا کہ اس کی نظیریں ماقبل میں پیش کی جا چکی ہیں،تو کوئی دشواری نہیں ہوگی۔

## مقروض مفلس کی نظیر

جس طرح کوئی شخص حقیقی اگر دیوالیہ ہو جائے تو قرض دینے والوں کو اس کے اثاثوں سے زیادہ مطالبہ کا حق نہیں ہوتا، حضرت معاذ بن جبلؓ کو حضورﷺ نے جب مفلس قرار دیا تھا تو آپ نے قرض خواہوں سے فرمایا تھا:

خُذُوا مَا وَجَدتُم ثُمَّ لَیسَ لَکُم اِلّا ذٰلِکَ۔۳۳

''جو تمہیں میسر ہو لے لو۔ اس کے ماسوا تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔''

البتہ قرض خواہوں کو اجازت ہوگی کہ اس کے تعاقب میں رہیں اور جوں ہی کہیں سے اس کے پاس مال آئے اپنا قرض وصول کرنے کی کوشش کریں۔ اسی طرح باوجود قدرت کے قرض ادا نہ کرنے کی صورت میں عنداللہ جواب دہی سے بھی وہ نہیں بچ سکتا۔

فَإِذَا سَأَلَ عَنْهُ فَأُخْبِرَ أَنَّهُ مُعْسِرٌ خَلَّى سَبِيلَهُ؛ لِأَنَّ مَا صَارَ مَعْلُومًا بِخَبَرِ الْعُدُولِ، فَهُوَ بِمَنْزِلَةِ الثَّابِتِ بِإِقْرَارِ الْخَصْمِ ، وَلَا يَحُولُ بَيْنَ الطَّالِبِ وَبَيْنَ مُلَازَمَتِهِ عِنْدَنَا۔۳۴

''قرض کی ادائیگی کے سوال پر اگر معلوم ہوا کہ وہ تنگ دست ہوگیا ہے تو اس کا راستہ چھوڑ دیا جائے گا، اس لیے کہ جو معتبر اشخاص کے ذریعہ معلوم ہوا اس کا درجہ وہی ہے جو فریق کے اقرار سے ثابت ہو اور ہمارے نزدیک طالب دین اور مدیون سے لگے رہنے میں رکاوٹ بھی نہیں ڈالی جائے گی۔''

قوله (قال المديون) أي بما أصله ثمن ونحوه إذ القسم الثانی القول فيه للمديون أنه معسر فلا يحتاج إلى تحليف الدائن..... فإن شهدا بأنه معسر خلّى سبيله ، ولا تكون هذه شهادة على النفي، فإن الإعسار بعد اليسار أمر حادث ، فتكون شهادة بأمر حادث لا بالنفي۔۳۵

''دوسری قسم یہ ہے کہ اس میں مدیون کی اس بات کا اعتبار کیا جائے گا کہ وہ تنگ دست ہوگیا ہے، پس دائن کو قسم دلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر دو شخص گواہی دیں کہ یہ واقعتاً تنگ دست ہے تو اس کا راستہ چھوڑ دیا جائے

گا اور یہ نفی پر شہادت قرار نہیں پائے گی، اس لیے کہ خوش حالی کے بعد تنگ دستی ایک امر حادث ہے، پس یہ امر حادث پر شہادت ہے، نہ کہ نفی پر۔''

**(ولم يحل بينه وبين غرمائه) أي لا يمنعهم من ملازمته عند الإمام، وقالا بالمنع عنها لكونه منظرا بإنظار الله تعالى، وهي أقوى من إنظار العبد بالتأجيل، ومعه لا ملازمة وله أنه منظر إلى قدرته على الإيفاء وهو ممكن كل حين فيلازمونه كي لا يخفيه۔**[۳۶]

''اس کے اور قرض خواہوں کے درمیان ملنے سے روکا نہیں جائے گا۔ یعنی طالب دین مدیون کے ساتھ مسلسل چمٹا رہے تو امام صاحب کے نزدیک کوئی حرج نہیں، لیکن صاحبین اس سے منع کرتے ہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہی اسے ڈھیل دے دی ہے۔ یہ بندوں کی مہلت سے زیادہ طاقت ور ہے۔ امام صاحب کی دلیل یہ ہے کہ اس کو ادائیگی کی قدرت تک مہلت دی گئی ہے اور یہ کسی وقت بھی ممکن ہے، اس لیے طالب دین اس کے ساتھ رہ سکتا ہے، تاکہ وہ کہیں روپوش نہ ہو جائے۔''

اسی طرح اگر کمپنی دیوالیہ ہو جائے تو اس سے بھی سرمایے سے زیادہ کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔ کمپنی کا دیوالیہ پن یہ ہے کہ وہ تحلیل ہو جائے اور اس کی اجتماعیت ٹوٹ جائے۔ اس طرح خراب الذمہ کی ذمہ داری ذاتی طور پر ڈائرکٹرس پر نہیں آئے گی۔

## کمپنی کے ساتھ 'لمیٹیڈ' کے لاحقہ کی معنویت

خصوصاً اس وقت جب کہ لوگ قرض دیتے وقت کمپنی کی مالی اور قانونی پوزیشن ضرور دیکھتے ہیں، کیوں کہ ہر سال کمپنی کی بیلنس شیٹ شائع ہوتی ہے، جس سے اس کی مالی پوزیشن کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کمپنی خود اپنے نام کے ساتھ لمیٹیڈ (محدود) کا لاحقہ لگاتی ہے، اس سے اس بات کا اظہار مقصود ہوتا ہے کہ دائنین ایسی کمپنی کو قرض دے رہے ہیں جس کی ذمہ داریاں محدود ہیں۔ اس کا واضح مطلب یہ ہوگا کہ اگر خدانخواستہ کمپنی فلاپ ہوگئی اور ان کے قرض ادا نہ کیے جاسکے تو ان کی طرف سے باقی

دیون کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔اس پوری صورت حال کو سامنے رکھتے ہوئے قرض خواہوں کے غرر کا تو کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا، البتہ ضرر اور اتفاقی حالات کا اندیشہ ضرور ہے، مگر ظاہر ہے کہ یہ قدرتی معاملہ ہے، اس کی ضمانت نہیں دی جا سکتی:

(و)الدين الصحيح (هو مالايسقط إلا بالاداء أو الابراء) ولو حكما بفعل يلزمه سقوط الدين فيسقط دين المهر بمطاوعتها لابن الزوج للابراء الحكمي۔[۳۷]

''دَین صحیح، یعنی وہ دین جو ادائیگی یا معاف کیے بغیر ساقط نہ ہو، گو کہ حکماً ہی ہو، کسی ایسے فعل سے جس سے سقوط دین لازم آئے، پس دَین مہر شوہر کے بیٹے کے ساتھ مطاوعت کی بنا پر ساقط ہو جائے گا، ابراء حکمی کی بنیاد پر۔''

## جائز کاروبار کرنے والی کمپنیوں کے شیئرز خریدنا جائز ہے

کمپنیوں کے ساتھ مشارکت کرنا اور ان کے شیئرز خریدنا فی نفسہ ناجائز نہیں، اس لیے کہ اگر ہم شرکت کی معروف قسموں میں سے کسی قسم میں اس کو داخل کریں، مثلاً شرکت عنان یا مضاربت وغیرہ، تو کچھ فرق کے باوجود ان قسموں کی روح بنیادی طور پر اس میں پائی جاتی ہے اور اگر شرکت کی معروف قسموں کے بجائے ہم کمپنی کو شرکت کی ایک نئی قسم قرار دیں، جو شرکت و اجارہ سے مرکب ہو تو بھی اس کے عدمِ جواز کی کوئی وجہ نہیں ہے، اس لیے کہ بنیادی طور پر اس میں کوئی ایسی واقعی چیز نہیں ہے جو شریعت کے کسی اصول سے متصادم ہو۔

اس لیے اگر کمپنی کا کاروبار بنیادی طور پر حلال ہو، مثلاً شراب کا کاروبار نہ ہو، یا اس کی بنیاد سودی لین دین پر نہ ہو وغیرہ، تو اس کے شیئرز کی خرید و فروخت جائز ہے، البتہ واضح طور پر حرام کاروبار یا ناجائز اصول تجارت پر مبنی کمپنی کے شیئرز خریدنا جائز نہیں ہے۔ نہ شیئرز جاری ہونے کے وقت انہیں لینا جائز ہے اور نہ بعد میں اسٹاک ایکسچینج سے لینا درست ہے، اس لیے کہ اس کو خریدنا دراصل خود ان ناجائز معاملات میں جانتے بوجھتے شریک ہونا ہے، جو گناہ ہے۔[۳۸]

## حواشی مراجع

۱- اسلام اور جدید معیشت وتجارت، مولانا محمد تقی عثمانی، مکتبہ معارف القرآن، کراچی، ص ۵۵

۲- حوالۂ سابق، ص ۶۲

۳- بدائع الصنائع فِي ترتيب الشرائع ، علاء الدين أبو بكر بن مسعود الكاساني، دار الكتب العلمية، بيروت، ۱۹۸۶ء، طبع دوم، ۱۶۶/۱۳

۴- یہ رائے ڈاکٹر حافظ مفتی عبدالواحد مفتی جامعہ مدنیہ لاہور نے اپنی کتاب 'جدید معاشی مسائل اور حضرت مولانا تقی عثمانی مدظلہ کے دلائل کا جائزہ' میں پیش کی ہے۔ ناشر مجلس نشریات اسلام کراچی، ۲۰۰۸ء

۵- الجوہرۃ النیرۃ، أبو بكر بن علي بن محمد الحدادي العبادي اليمني، الزبيدي، ۱۰۹/۳

۶- امداد الفتاویٰ، ج ۳، ص ۴۶۴

۷- تحفۃ الفقہاء، علاء الدین السمرقندی، باب شرکۃ العنان، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۰۹/۳

۸- الاختیار لتعلیل المختار، عبد اللہ بن محمود بن مودود الموصلی الحنفی، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۲۰۰۵ء، طبع سوم، ۱۸/۳

۹- البحر الرائق شرح کنز الدقائق، زین الدین ابن نجیم الحنفی، دار المعرفۃ، بیروت، ۱۹۱/۵

۱۰- تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق، عثمان بن علی بن محجن البارعی، فخر الدین الزیلعی الحنفی، المطبعۃ الکبری المیمنیہ بولاق: ۱۳۱۳ھ، ۳۲۰/۳

۱۱- البحر الرائق شرح کنز الدقائق، ۱۹۱/۵

۱۲- بدائع الصنائع فِي ترتيب الشرائع، ۱۸۱/۱۳

۱۳- الدر المختار شرح تنویر الابصار، محمد علاء الدین بن علی الحصکفی، ۶۶۱/۴، رد المحتار علی الدر المختار، ابن عابدین، ۱۸/۱۸

۱۴- البحر الرائق شرح کنز الدقائق، ۲۲۸/۵

۱۵- الحاوی للفتاوی، جلال الدین السیوطی، دار الکتب العلمیۃ، بیروت

۱۶- البحر الرائق شرح کنز الدقائق، ۲۵۹/۵

۱۷- البحر الرائق، ۲۲۷/۵

۱۸- تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق،۳/۳۸۳،البحر الرائق شرح کنز الدقائق،۵/۱۲۸

۱۹- الدر المختار،۳/۳۳۷

۲۰- رد المحتار علی الدر المختار،۲/۳۳۷

۲۱- درر الحکام شرح غرر الحکام،محمد بن فراموز خسرو،۳/۴۱۲

۲۲- جدید معاشی مسائل اور حضرت مولانا تقی عثمانی مدظلہ کے دلائل کا جائزہ۔

۲۳- البحر الرائق شرح کنز الدقائق،۵/۲۲۷

۲۴- تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق وحاشیۃ الشلبی،۶/۲۱۴

۲۵- البحر الرائق شرح کنز الدقائق،۵/۱۴۴

۲۶- رد المحتار علی الدر المختار،۸/۵۰۴

۲۷- المبسوط للسرخسی،دار الفکر للطباعۃ والنشر والتوزیع،بیروت،۲۰۰۰ء،۱۹/۳۱۷

۲۸- مغنی المحتاج إلی معرفۃ ألفاظ المنہاج،محمد بن أحمد الطیب الشربینی،۴/۴۰۶

۲۹- أسنی المطالب فی شرح روض الطالب،زکریا الانصاری،دار الکتب العلمیۃ،بیروت،۲۰۰۱ء،۱/۳۴۸

۳۰- بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع،۱۳/۲۶۲

۳۱- حوالۂ سابق،۱۳/۲۶۶

۳۲- مجمع الضمانات فی مذہب الإمام الأعظم أبی حنیفۃ النعمان،ابو محمد بن غانم بن محمد البغدادی،۲/۲۵۲

۳۳- صحیح مسلم،باب وضع الجوائح

۳۴- المبسوط،۱۰/۷

۳۵- رد المحتار علی الدر المختار،ابن عابدین،۵/۳۸۶

۳۶- البحر الرائق شرح کنز الدقائق،۶/۳۱۳

۳۷- الدر المختار،۵/۴۳۶

۳۸- امداد الفتاویٰ ج۳،ص۱۳۰

## اقتصادیات

# کسبِ معاش اور اسلام

مولانا محمد انس فلاحی مدنی

صالح اور فطری زندگی کا مدار روح کی تربیت اور جسم کی غذا پر منحصر ہے۔ روح کی سالمیت اور جسم کی نشو ونما انسان کی بنیادی ضروریات میں سے ہیں۔ روح کی سالمیت کے تحفظ اور بقا کو روحانی زندگی کا ارتقا کہتے ہیں۔ انسان کی روحانی تربیت واصلاح کا سامان روزِ اول سے انبیاء ورسل کے ذریعہ ہوا ہے۔ انسان خدائی ہدایت سے ناآشنا ہوتو روحانی تربیت اور معرفتِ الٰہی کے حصول کے لیے خود ساختہ پگڈنڈی پر چل پڑتا ہے، اپنے نفس کو غیر ضروری مشقت وآزمائش میں مبتلا کر دیتا ہے۔ رہبانیت یا دنیا سے بیزاری کا تصور اسی قبیل کی چیز ہے۔ معاش بھی انسانی معاشرے کی بنیادی ضرورت ہے۔ اس کے حصول کے لیے انسان روزِ اول سے فکر مند رہا ہے۔ اسلام نے انسانی زندگی کے فطری نشو ونما کے لیے روح اور جسم دونوں کے تقاضے پورے کرنے کا سامان مہیا کیا ہے۔ روح کی تربیت وتزکیہ کے لیے عبادات کو لازمی قرار دیا ہے اور جسم کی دو بنیادی ضرورتوں: غذا اور جنسی خواہشات کی تکمیل کا بھی مناسب اور فطری نظام اور ضابطہ مقرر کیا ہے۔ ان سے سرمو انحراف انسان کو مشقت ومصیبت میں مبتلا کر دیتا ہے۔

غذا انسانی زندگی کی بقا کے لیے لازمی جز ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے زمین وآسمان، شجر وحجر، چرند وپرند سب کو انسان کے لیے مسخر کر دیا ہے۔ افزائشِ دولت کے متعدد ذرائع: حیوانی (جانور)، نباتی (کھیت اور باغات)، جماداتی، نیز بحر وبحر میں موجود خزانے کا قرآن مجید میں ذکر کیا ہے۔ یہ سب انسانوں کے لیے نفع رسانی کا ذریعہ ہیں۔

ارشاد باری ہے:

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ (الاعراف:۱۰)

''ہم نے تمھیں زمین میں اختیارات کے ساتھ بسایا اور تمھارے لیے یہاں سامانِ زیست فراہم کیا، مگر تم لوگ کم ہی شکر گزار ہوتے ہو۔''

هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذَلُولًا فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا وَكُلُوا مِن رِّزْقِهِ وَإِلَيْهِ النُّشُور (الملک:۱۵)

''وہی تو ہے جس نے تمھارے لیے زمین کو تابع کر رکھا ہے۔ چلو اُس کی چھاتی پر اور کھاؤ اللہ کا رزق۔ اُسی کے حضور تمھیں دوبارہ زندہ ہو کر جانا ہے۔''

أَلَمْ تَرَوْا أَنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَأَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهُ ظَاهِرَةً وَبَاطِنَةً (لقمان:۲۰)

''کیا تم لوگ نہیں دیکھتے کہ اللہ نے زمین اور آسمانوں کی ساری چیزیں تمھارے لیے مسخر کر رکھی ہیں اور اپنی کُھلی اور چھپی نعمتیں تم پر تمام کر دی ہیں؟''

رزق کے حصول و تقسیم کا فطری نظام ہی انسانی معاشرے کی بقا و سالمیت کی اولین شرط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے معاش، ذرائع معاش اور مصارفِ معاش کے تعلق سے بہت واضح احکام دیے ہیں۔ مومن کو مال کہاں سے، کیسے کمانا اور کہاں خرچ کرنا ہے؟ روز آخرت بندۂ مومن سے جو پانچ سوالات کیے جائیں گے، ان میں سے دو سوال مال کمانے اور خرچ کرنے سے متعلق ہوں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

لا تزولُ قدما عبدٍ يومَ القيامةِ حتّٰى يُسئل عن عمره فيما أفناه؟ وعن علمه فيم فعل؟ وعن ماله من أين اكتسبه وفيم أنفقه؟ وعن جسمه فيم أبلاه؟[۱۱]

''قیامت کے دن کسی بندے کے دونوں پاؤں نہیں ہٹیں گے، یہاں تک کہ اس سے یہ نہ پوچھ لیا جائے: عمر کے بارے میں کہ اسے کن کاموں میں لگائی؟ اور اس کے علم کے بارے میں کہ اس پر کیا عمل

کیا؟ اور مال کے بارے میں کہ کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟ اور اس کے جسم کے بارے میں کہ اسے کہاں کھپایا؟''

قرآن مجید نے اس حقیقت کو بار بار دہرایا ہے کہ تمام وسائل وذرائع جن پر انسان کی معاش کا انحصار ہے، اللہ تعالیٰ نے پیدا کیے ہیں، انھیں انسانیت کے لیے نفع بخش بنایا ہے اور انسان کو ان سے فائدہ اٹھانے اور ان پر تصرف کا اختیار بخشا ہے:

ذٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ لا إِلَهَ إِلَّا هُوَ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوهُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ (الانعام:۱۰۳)

''اللہ تمھارا رب، کوئی خدا اس کے سوا نہیں ہے، ہر چیز کا خالق، لہٰذا تم اسی کی بندگی کرو اور وہ ہر چیز کا کفیل ہے۔''

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُم مَّا فِيْ الْأَرْضِ جَمِيْعاً (البقرة:۲۹)

''وہی تو ہے جس نے تمھارے لیے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں۔''

یہ اختیار بھی اس شرط کے ساتھ ہے کہ مال حاصل کرنے اور اسے خرچ کرنے، دونوں میں حلال وحرام کی تمیز کرنا ضروری ہے:

يٰآيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُواْ لاَ تَأْكُلُواْ أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَن تَكُونَ تِجَارَةً عَن تَرَاضٍ مِّنكُمْ وَلاَ تَقْتُلُواْ أَنفُسَكُمْ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا (النساء:۲۹)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ۔ لین دین ہونا چاہیے آپس کی رضامندی سے اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو۔ یقین مانو کہ اللہ تمھارے اوپر مہربان ہے۔''

مال کی محبت انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ انسان حصول مال کی تگ ودو میں ہر جدوجہد کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے۔ مال کی محبت میں بسا اوقات ہر حد سے گزر جاتا ہے۔ یہ محبت خونی رشتوں پر بھی حاوی ہو جاتی ہے۔ اس کا نقشہ درج الفاظ میں کھینچا گیا ہے:

وَإِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ (العادیات:۸)

''اور وہ مال ودولت کی محبت میں بری طرح مُبتلا ہے۔''

## قرآن میں معاشی جدّ وجہد کی ترغیب

مومن کی زندگی کے شب وروز کی تقسیم بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے رات کو سونے اور سکون وطمانینت حاصل کرنے کا ذریعہ قرار دیا ہے اور دن کو معاشی جد وجہد کا وقت بتایا ہے۔ ارشاد باری ہے:

وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ لِبَاساً o وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشاً (النبأ:۹-۱۰)

''اور رات کو پردہ پوش اور دن کو معاش کا وقت بنایا۔''

یہ آیت کریمہ مومن کی زندگی کے شب و روز کے حسنِ تقسیم کو بیان کرتی ہے۔ مومن دن میں رزق کی فراہمی کے لیے تگ ودو کرے اور رات میں اپنے جسم کو راحت وسکون پہنچائے۔ یہ اس کے لیے اللہ کی طرف سے شب وروز کی تقسیم ہے۔

امام ابو اسحاق الشاطبیؒ (م۷۹۰ھ) نے اس پہلو پر روشنی ڈالی ہے کہ دنیا کی آسائش وزیبائش کا استعمال ایمان کے منافی نہیں ہے، بلکہ لذّاتِ دنیا اور جبلّی خواہشات کو دبانا اسلام مخالف عمل ہے۔ وہ رقم طراز ہیں:

> ''جب اللہ تعالیٰ نے دنیا اور اس کے ساز وسامان کی مذمت فرمائی تو صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت نے ارادہ کیا کہ دنیا سے الگ ہو جائیں، عورتیں اور لذاتِ دنیا کو چھوڑ کر عبادت میں لگ جائیں۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ نے ان کے اس ارادہ کی تردید کی اور فرمایا: ''جو میرے طریقے سے اعراض کرے اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔[۲] اور یہ آیت نازل ہونے کے باوجود کہ ''تمھارے اموال اور اولاد تمھارے لیے محض آزمائش ہیں۔'' لوگوں کے لیے کثرت مال واولاد کے لیے دعا فرمائی، جب کہ مال اور اولاد ہی دنیا ہے۔ آپؐ نے صحابہؓ کے لیے حلال طریقوں سے دنیا کو جمع کرنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کی ترغیب فرمائی۔ آپؐ نے انہیں دنیا سے بے رغبتی نہیں سکھائی، نہ دنیا کو چھوڑنے کا حکم دیا، الّا یہ کہ ایسی غرض ظاہر ہو جس سے کسی کی حق تلفی

ہوتی ہو اور اس وجہ سے افراط وتفریط کا گمان پایا جاتا ہو، بہ صورت دیگر اس کی کوئی ممانعت نہیں۔''[۳]

اسلام تجرد، ترکِ دنیا اور رہبانیت کی تعلیم نہیں دیتا۔ اس کے نزدیک آسائش اور نعمت کا استعمال معیوب نہیں، بلکہ وہ دنیا کی نعمتوں سے حدود وآداب کا پاس ولحاظ رکھتے ہوئے لطف اندوز ہونے کی اجازت دیتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْ أَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ قُلْ هِيْ لِلَّذِيْنَ آمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُوْنَ (الاعراف:۳۲)

''اے نبیؐ! ان سے کہو، کس نے اللہ کی اُس زینت کو حرام کر دیا جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لیے نکالا تھا اور کس نے اللہ کی بخشی ہوئی پاک چیزیں ممنوع کر دیں؟ کہو، یہ ساری چیزیں دنیا کی زندگی میں بھی ایمان لانے والوں کے لیے ہیں اور قیامت کے روز تو خالصتاً انہی کے لیے ہوں گی۔''

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِيْنَ أَعْمَالاً. اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا (الکہف:۱۰۳-۱۰۴)

''اے نبیؐ! ان سے کہو، کیا ہم تمھیں بتائیں کہ اپنے اعمال میں سب سے زیادہ ناکام ونامراد لوگ کون ہیں؟ وہ کہ دنیا کی زندگی میں جن کی ساری سعی وجہد راہِ راست سے بھٹکی رہی اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ سب کچھ ٹھیک کر رہے ہیں۔''

مومن ظاہری حسن وجمال سے آراستہ ہو، اس کی ترغیب رسول اللہ ﷺ نے دی ہے۔ حضرت مالک بن نضلہ جشمیؓ روایت کرتے ہیں کہ وہ نبی اکرم ﷺ کے پاس بہت معمولی قسم کے کپڑے پہن کر آئے تو آپ نے فرمایا: ''کیا تمہارے پاس مال و دولت ہے؟'' وہ بولے: جی ہاں، سب کچھ ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ''کس طرح کا مال ہے؟ انھوں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے مجھے اونٹ، بکریاں، گھوڑے اور غلام عطا کیے ہیں۔

آپؐ نے فرمایا: ''جب اللہ تعالیٰ نے تمھیں مال و دولت سے نوازا ہے تو اس کی نعمت اور اس کے فضل کے تم پر آثار بھی دکھائی دینے چاہییں''۔[۹۳]

دنیوی زندگی کو بہتر گزارنے اور برتنے کے لیے معاش بنیادی ضرورت ہے۔ اس کے لیے جدو جہد، تگ ودو، دوڑ دھوپ دین ہی کا مطالبہ ہے۔ اسلام مومن کی زندگی کو ہر لحاظ سے کامل بنانا چاہتا ہے۔ مومن بے سہارا، تنگ دست اور مجبور نہ ہو، اس لیے کسبِ معاش کی بارہا ترغیب دی ہے، ارشاد باری ہے:

وَابْتَغِ فِيمَا اٰتٰكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَأَحْسِن كَمَا أَحْسَنَ اللّٰهُ إِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ (القصص:۷۷)

''جو مال اللہ نے تجھے دیا ہے اس سے آخرت کا گھر بنانے کی فکر کر اور دنیا میں سے بھی اپنا حصہ فراموش نہ کر۔ احسان کر، جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے اور زمین میں فساد برپا کرنے کی کوشش نہ کر۔ اللہ مفسدوں کو پسند نہیں کرتا۔''

فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِن فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيراً لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (الجمعۃ:۱۰)

''پھر جب نماز پوری ہوجائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتے رہو، شاید کہ تمھیں فلاح نصیب ہوجائے۔''

اس آیتِ کریمہ میں نماز سے فراغت اور عبادت کی ادائیگی کے بعد معاشی جدّ وجہد کی تعلیم دی گئی ہے۔ حصولِ معاش کے لیے تگ و دَو اور محنت کرنا اسلام کی نظر میں پسندیدہ امر ہے، بلکہ وہ اس کی ترغیب دیتا ہے، گویا اسلام مومن کو معاشی لحاظ سے خوش حال دیکھنا پسند کرتا ہے۔

مال کو قرآن کریم کی متعدد آیات میں 'فضل' اور 'خیر' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمِن رَّحْمَتِهِ جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِن

فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (القصص:۷۳)

''یہ اسی کی رحمت ہے کہ اس نے تمھارے لیے رات اور دن بنائے، تاکہ تم (رات میں) سکون حاصل کرو اور (دن میں) اپنے رب کا فضل تلاش کرو، شاید کہ تم شکرگزار بنو۔''

وَجَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا (بنی اسرائیل:۱۲)

''اور ہم نے دن کی نشانی کو روشن کر دیا، تاکہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کر سکو اور ماہ وسال کا حساب معلوم کر سکو۔ اسی طرح ہم نے ہر چیز کو الگ الگ ممیّز کر کے رکھا ہے۔''

[مزید ملاحظہ کیجیے: البقرۃ:۲۱۵، ۲۷۲، الروم:۲۴، المزمل:۲۰]

حدیثِ نبوی ﷺ میں بھی مال کو نعمت کہا گیا ہے۔ حضرت عمرو بن العاصؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے میرے پاس کہلا بھیجا: ''اپنے ہتھیاروں اور کپڑوں کو اکٹھا کر کے میرے پاس آجاؤ۔'' میں آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؐ اس وقت وضو کر رہے تھے۔ فرمایا: ''اے عمرو! میں نے تمھیں اس لیے بلایا ہے کہ تمھیں ایک سمت روانہ کروں۔ اللہ تمھیں سلامت رکھے اور تمھیں مالِ غنیمت عطا فرمائے اور کچھ مال میں تمھیں دوں۔'' میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! میری ہجرت مال و دولت کے لیے نہ تھی۔ وہ تو محض اللہ اور اس کے رسول کے لیے تھی۔ آپؐ نے فرمایا: يَا عَمْرُو! نِعِمَّا بِالْمَالِ الصَّالِحِ لِلْمَرْءِ الصَّالِحِ ''اچھا مال نیک شخص کے لیے اچھی شئے ہے۔''

یہ حدیث مال کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت کرتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں مال فی نفسہٖ معیوب اور ناپسندیدہ شئی نہیں ہے۔ اگر اسے حلال طریقے سے حاصل کیا گیا ہو اور صالح انسان کے پاس ہو تو وہ نفع بخش ہے۔ مال اسی صورت میں فساد کا محرک بنتا ہے جب انسان کی نیت میں فساد آجائے اور وہ مال کا حریص بن جائے اور اس کے حصول اور خرچ میں اسلامی حدود کا پاس ولحاظ نہ رکھے۔ ایک دوسری حدیث سے بھی مال کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت ہوتی ہے۔

حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

إِنَّ هَـذَا الْمَالَ خَضِرَةٌ حُلْوَةٌ، فَمَنْ أَخَذَهُ بِحَقِّهِ، وَوَضَعَهُ فِي حَقِّهِ، فَنِعْمَ الْمَعُونَةُ هُوَ، وَمَنْ أَخَذَهُ بِغَيْرِ حَقِّهِ، كَانَ كَالَّذِي يَأْكُلُ وَلَا يَشْبَعُ ويكونُ عليه شهيدًا يومَ القيامَةِ[۶]

''یہ مال ہرا بھرا اور دل آویز ہے۔ جو شخص اسے جائز طریقے سے حاصل کرے اور جائز مصارف میں خرچ کرے تو وہ بہترین مددگار ہے۔ اور جو شخص اسے ناجائز طریقے سے حاصل کرے تو وہ اس شخص کے مانند ہوتا ہے جو کھاتا رہتا ہے اور سیر نہیں ہوتا اور وہ مال قیامت کے روز اس کے خلاف گواہی دے گا۔''

مال اور صحت کو متقی شخص کے لیے نعمت کہا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لا بَأس بِالغِنٰى لمن اتّقٰى، والصّحّةُ لمن اتّقٰى خيرٌ مِنَ الغِنٰى، و طِيبُ النَّفسِ مِنَ النَّعِيمِ[۷]

''ایسے شخص کے لیے دولت مندی کوئی بری شئے نہیں جو اللہ عزوجل سے ڈرے اور متقی کے لیے صحت دولت سے بہتر ہے اور شادمانی اور خوش دلی خدا کی نعمتوں میں سے ہے۔''

انسان کی دنیا اور آخرت دونوں خوش گوار ہوں۔ درج ذیل قرآنی دعا کا یہی پیغام ہے:

وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِيْ الآخِرَةِ (الاعراف:۱۵۶)

''اور ہمارے لیے اس دنیا کی بھلائی بھی لکھ دیجیے اور آخرت کی بھی''

ایک جگہ اولیاء اللہ کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ کا تقویٰ اختیار کرتے ہیں، انہیں کوئی رنج وغم نہیں ہوگا، ان کے لیے دنیا اور آخرت کی زندگی میں خوش خبری ہے، یعنی دنیا کی زندگی میں بھی اپنے اولیاء کے لیے راحت واطمینان پہنچانا اللہ کا مقصود ہے:

لَهُمُ الْبُشْرٰى فِيْ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِيْ الآخِرَةِ لاَ تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ

ذَلِکَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْم (یونس:۶۴)

''دنیا اور آخرت دونوں زندگیوں میں اُن کے لیے بشارت ہے۔ اللہ کی باتیں بدل نہیں سکتیں۔ یہی بڑی کام یابی ہے۔''

اس کے علاوہ اور بھی متعدد آیات ہیں، جن میں اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ دنیا کو خوش گوار بنانا دین کے منافی نہیں ہے۔

## احادیث میں کسبِ معاش کی ترغیب

حدیث میں کسبِ معاش کی ترغیب متعدد پہلوؤں سے دی گئی ہے۔ کہیں آدمی کے اپنے ہاتھ سے کما کر کھانے کو بہترین کمائی قرار دیا گیا ہے اور کہیں کسی دوسرے کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے عار دلائی گئی ہے، تاکہ وہ محنت کرکے روزی حاصل کرے اور کسی کا محتاج نہ بنے۔ اس ضمن میں چند احادیث کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے:

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

طَلَبُ الحَلَالِ فَرِیضَةٌ بَعدَ الفَرِیضَةِ[۸]

''رزق حلال کی طلب وجستجو کرنا، ایک فریضہ کے بعد دوسرا فریضہ ہے۔''

حضرت رافع بن خدیجؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا ﷺ سے دریافت کیا گیا: کون سی کمائی سب سے بہتر ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

عَمَلُ الرَّجُلِ بِیَدِهِ وَکُلُّ بَیْعٍ مَبْرُورٍ[۹]

''انسان کا اپنے ہاتھ سے کام کرکے کمانا اور ہر دیانت دارانہ بیع (خرید وفروخت)۔''

حضرت مقدامؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

مَا أَکَلَ أَحَدٌ طَعَامًا قَطُّ خَیْرًا مِنْ أَنْ یَأْکُلَ مِنْ عَمَلِ یَدِهِ، وَإِنَّ نَبِیَّ اللَّهِ دَاوُدَ عَلَیْهِ السَّلاَمُ کَانَ یَأْکُلُ مِنْ عَمَلِ یَدِهِ[۱۰]

''اس شخص سے بہتر کھانا کسی نے نہیں کھایا جو اپنے ہاتھ سے محنت کرکے کھائے۔ اللہ کے نبی داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ سے محنت کرکے کھاتے تھے۔''

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

إِنَّ مِنَ الذُّنُوبِ ذُنُوبًا لَا تُكَفِّرُهَا الصَّلَاةُ وَلَا الصِّيَامُ وَلَا الْحَجُّ وَلَا الْعُمْرَةُ ، قَالُوا: فَمَا يُكَفِّرُهَا يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ قَالَ: الْهُمُومُ فِي طَلَبِ الْمَعِيشَةِ [۱۱]

''بعض گناہ ایسے ہیں جنھیں نہ نماز معاف کرتی ہے نہ روزہ، حج اور عمرہ۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! پھر انھیں کیا معاف کرواتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ان کا کفارہ صرف طلبِ معیشت کی فکر اور کاوش ہی سے ہوسکتا ہے۔''

شارحین نے بالعموم یہاں 'لا تُكَفِّرُهَا' کے معنیٰ 'گناہ معاف کرنا' مراد لیے ہیں۔ اگر اس کے بجائے 'گناہ کے مواقع مٹانا' مراد لیا جائے تو مفہوم اور واضح ہوجاتا ہے۔ طلبِ معیشت کی فکر اور جدّ و جہد انسان کو بہت سے گناہوں سے بچا لیتی ہے۔ انسان کے خیالات پراگندہ ہونے سے بچ جاتے ہیں، شیطانی وسوسے، فضول باتیں اور لہو ولعب کے لیے اسے موقع نہیں رہتا۔

بے روزگاری اور بے کاری بہت سے مسائل کو جنم دیتی ہے۔ انسان نفسیاتی طور پر کم زور ہوجاتا ہے، فرصت کے اوقات اس کے خیالات کو منفی رخ پر لے جاتے ہیں۔ مشغولیت انسان کو بہت سے لایعنی کاموں اور گناہوں سے بچاتی ہے۔ کسبِ معاش کی فکر اور جدّ و جہد ان داعیات کے لیے سدّ راہ بن سکتی ہے۔ کسی کے آگے دستِ سوال دراز کرنا، مانگنا اور مانگنے کو عادت بنالینا اسلام میں سخت ناپسندیدہ ہے اور اس کی سخت مذمت کی گئی ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لَأَنْ يَحْتَطِبَ أَحَدُكُمْ حُزْمَةً عَلَى ظَهْرِهِ، خَيْرٌ لَهُ مِنْ أَنْ يَسْأَلَ أَحَدًا، فَيُعْطِيَهُ أَوْ يَمْنَعَهُ [۱۲]

''تم میں سے کوئی لکڑیاں جمع کرکے اپنی پیٹھ پر گٹھر لاد کر لائے، یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ کسی کے سامنے اپنی حاجت رکھے، پھر وہ اس کو دے یا نہ دے۔''

حضرت ابو ہریرہؓ ہی سے ایک دوسری روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

مَن طَلَبَ الدُّنیَا حَلالاً استِعفَافاً عَنِ المَسئَلَةِ وَسَعیاً عَلٰی أهلِهِ وَ تَعَطُّفاً عَلَی جَارِهِ لَقِیَ اللّٰه تَعَالیٰ یَومَ القِیَامَةِ وَ وَجهُهُ مِثلُ القَمَرِ لَیلَةَ البَدرِ ، وَمَن طَلَبَ الدُّنیَا حَلالاً مُکَاثِراً مُفَاخِراً مُرَائِیاً لَقِیَ اللّٰه تَعَالیٰ وَهُوَ عَلَیه غَضبَان ۱۳

''جو شخص حلال اور جائز طریقے سے دنیا (کے مال و اسباب) اس غرض سے حاصل کرے تا کہ وہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی ذلت سے بچ سکے اور اپنے اہل وعیال کی ضروریات پوری کر سکے اور اپنے پڑوسی کے ساتھ احسان وسلوک کر سکے تو وہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ اس کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی مانند ہوگا۔ اس کے برخلاف جو شخص حلال طریقے سے سہی، دنیا اس غرض سے حاصل کرے تا کہ اس کے مال میں اضافہ ہو، وہ لوگوں پر فخر جتائے اور اسے نام ونمود حاصل ہو تو وہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملے گا کہ اللہ اس پر سخت غضب ناک ہوگا۔''

ایک روایت میں دستِ سوال دراز نہ کرنے پر جنت کی بشارت دی گئی ہے۔

حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

مَنْ تَکَفَّلَ لِی أن لا یَسْأَلَ النَّاسَ شَیئاً أتَکَفَّلُ له بالجنة ،فقال ثوبان:أنَا ، فکان لا یَسألُ أحَداً ۱۴

''جو شخص مجھے اس بات کی ضمانت دے کہ وہ لوگوں کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کرے گا تو میں اس کے لیے جنت کی ضمانت دوں گا۔ ثوبانؓ نے کہا: میں۔ چنانچہ وہ کسی سے کوئی چیز نہیں مانگتے تھے۔''

عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول ﷺ نے فرمایا:

الْیَدُ الْعُلْیَا خَیْرٌ مِنَ الْیَدِ السُّفْلَیٰ ، وَالْیَدُ الْعُلْیَا الْمُعْطِیَةُ وَالسُّفْلَی السَّائِلَةُ ۱۵

''اوپر کا ہاتھ بہتر ہے نیچے کے ہاتھ سے۔اور اوپر کا ہاتھ خرچ کرنے

والا ہے اور نیچے کا ہاتھ مانگنے والا۔''

ایک حدیث میں لوگوں سے مانگنے پر سخت وعید سنائی گئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

مَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَسْأَلُ النَّاسَ، حَتَّى يَأْتِيَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَيْسَ فِي وَجْهِهِ مُزْعَةُ لَحْمٍ [۱۶]

''آدمی ہمیشہ لوگوں سے سوال کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے منہ پر ایک بوٹی گوشت کی نہ ہوگی۔''

کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانا اور اپنی ضرورت کی تکمیل کے لیے کسی کا محتاج بننا دراصل انسان کے وقار کو مجروح کر دیتا ہے، اس کی وقعت ختم ہو جاتی ہے اور اس کی بات بے وزن ہو جاتی ہے۔ اسلام مومن کو خود دار اور غیرت مند دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب وہ خود کفیل ہو، اپنی ضروریات کو پوری کرنے کی اہلیت رکھتا ہو اور معاشی لحاظ سے خوش حال ہو۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے کسبِ معاش کی تلقین کی ہے اور دست سوال دراز کرنے والے عادی شخص کو سخت وعید سنائی ہے۔

ایک انصاری صحابی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور امداد طلب کی۔ آپؐ نے دریافت کیا: تمھارے پاس کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا: ''ٹاٹ کا ایک ٹکڑا، جس کا ایک حصہ بچھاتا ہوں اور دوسرا حصہ اوڑھتا ہوں اور ایک پیالہ، جس سے پانی پیتا ہوں۔ آپؐ نے وہ ٹاٹ اور پیالہ منگوایا، پھر خود بولی لگا کر انھیں دو درہم میں فروخت کیا۔ ایک درہم گھر کے خرچ (کھانے پینے) کے لیے عطا فرمایا اور دوسرے سے کلہاڑی خرید کر لانے کی ہدایت فرمائی۔ نیز کلہاڑی آنے پر اپنے دستِ مبارک سے اس میں دستہ لگایا اور فرمایا: جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاؤ اور بیچو، پندرہ دن سے پہلے میرے پاس نہ آنا۔ وقتِ موعود پر وہ صحابیؓ حاضر خدمت ہوئے اور بتایا کہ دس درہم آمدنی ہوئی ہے، جس سے کپڑے اور غلّہ خریدا ہے۔ تب آپؐ نے فرمایا:

أَلَيْسَ هَذَا خَيْرًا لَكَ مِنْ أَنْ تَجِيءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَمَسْأَلَتُكَ فِي وَجْهِكَ نُكْتَةَ سَوْدَاءَ، لَا يَمْحُوهَا إِلَّا النَّار [۱۷]

''کیا یہ تمہارے لیے اس سے بہتر نہیں کہ تم قیامت کے دن بھیک مانگنے کی وجہ سے داغ والے چہرے سے آؤ، جس کو صرف جہنم کی آگ ہی مٹا پائے گی؟''

ایک دن رسول اللہ ﷺ اپنے اصحاب کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ اچانک آپؐ کی نظر ایک ہٹے کٹے جوان پر پڑی، جو طلبِ معاش کے لیے محنت کرنے میں مصروف تھا۔ بعض صحابہ نے کہا: افسوس! یہ اس کام میں مشغول ہے، کاش! اس کی جوانی اور طاقت اللہ کی راہ میں کام میں آتی۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

إِنْ كَانَ خَرَجَ يَسْعَى عَلَى وَلَدِهِ صِغَارًا فَهُوَ فِي سَبِيلِ اللهِ، وَإِنْ كَانَ خَرَجَ يَسْعَى عَلَى أَبَوَيْنِ شَيْخَيْنِ كَبِيرَيْنِ فَهُوَ فِي سَبِيلِ اللهِ، وَإِنْ كَانَ يَسْعَى عَلَى نَفْسِهِ يُعِفُّهَا فَهُوَ فِي سَبِيلِ اللهِ، وَإِنْ كَانَ خَرَجَ رِيَاءً وَمُفَاخَرَةً فَهُوَ فِي سَبِيلِ الشَّيْطَانِ[۱۸]

''اگر یہ شخص اپنے بے کس و مجبور بچوں کے لیے جدّ وجہد کر رہا ہے تو اللہ کی راہ میں ہے۔ اور اگر وہ اپنے ضعیف و ناتواں والدین کے لیے محنت میں مصروف ہے تو اللہ کی راہ میں ہے۔ اور اگر وہ دستِ سوال دراز کرنے کی ذلت سے بچنے کے لیے اور لوگوں سے بے نیاز ہونے کے لیے محنت کر رہا ہے تو اللہ کی راہ میں ہے۔ اور اگر وہ مال کی کثرت اور دوسروں پر مفاخرت کے لیے محنت کر رہا ہے تو شیطان کی راہ پر چل رہا ہے۔''

## معاشی جدّ وجہد اور مسلم مفکرین

معاشی جدوجہد کا اسلامی نقطۂ نظر سب سے پہلے امام ابوحنیفہؒ (م۱۵۰ھ) کے شاگرد رشید امام محمد بن حسن شیبانیؒ (م۱۸۹ھ) نے بیان کیا۔ انھوں نے اپنی تصنیف 'کتاب الکسب' میں کسبِ معاش کی فضیلت اور معاش کے حلال و حرام ذرائع بیان کیے ہیں۔ کرامیہ فرقہ اور صوفیہ کے اس نظریہ کی تردید کی ہے کہ رزق کے لیے جدو جہد کرنا توکل کے منافی ہے۔ ان حضرات کی دلیل یہ تھی کہ ہمیں اللہ ہی پر توکل کرنا چاہیے۔ امام محمدؒ نے بہت صراحت اور وضاحت کے ساتھ اس پہلو پر روشنی ڈالی کہ معاش کے لیے

اسباب کا اختیار کرنا توکل کے منافی نہیں ہے۔ ۱۹ساتھ ہی انہوں ذرائع معاش اور مصارف، مال کا ذکر کرنے کے ساتھ اسراف اوراعتدال پربھی بحث کی ہے۔

امام محمدؒ نے اپنی کتاب میں معاشی تگ ودو کے اسلامی مزاج کی وضاحت میں بہ طور دلیل انبیاء ورسل کی معاشی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے۔ باوجوداس کے وہ اللہ کے رسول تھے، دعوت ورسالت کے عظیم کام میں مشغول تھے، لوگوں کی ہدایت ورہ نمائی ان کا فریضہ منصبی تھا، پھربھی معاشی جدّ و جہدان کی زندگی کا حصہ تھی۔ وہ عام لوگوں کی طرح کاروباراورخرید وفروخت کرتے تھے۔حضرت آدم علیہ السلام کاشت کار، حضرت نوحؑ اور حضرت زکریاؑ بڑھئی اورحضرت ادریسؑ درزی تھے، حضرت ابراہیمؑ کپڑے کا کام کرتے تھے۔حضرت داؤدؑ لوہار تھے اور خاتم النبیین حضرت محمدﷺ نے بکریاں چرائی تھیں اور تجارت بھی کی تھی۔ ۲۰

انبیاء کرام کو رہتی دنیا تک کے انسانوں کے لیے نمونۂ عمل بننا تھا، اس لیے ضروری تھا کہ وہ عام لوگوں کی طرح معاشی تگ ودو کرتے نظر آئیں۔ اللہ تعالیٰ چاہتا تو انہیں ان کاموں سے فارغ رکھتا اوران کے معاش کا کوئی اورانتظام کر دیتا۔ اس امر کے پیچھے اللہ کی یہ حکمت تھی کہ دین کا کتنا بھی عظیم ترین کام ہواور کتنا مقبول ومحبوب ترین بندہ ہو، وہ خود کفیل بنے اور کسی کے آگے دستِ سوال دراز نہ کرے۔

امام ابن قیمؒ (م۷۵۱ھ) نے اپنی تصنیف 'عدّة الصابرین وذخیرة الشاکرین' میں مال اوراس کے مادی اور دینی فوائد پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے مال کے تعلق سے سعید بن مسیّبؒ، ابواسحاق السبیعی، محمد بن المنکدر، سفیان ثوری اور یوسف بن اسباط کے اقوال ذکر کیے ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ مال آدمی کو دین پر دل جمعی میں معاونت کرتا ہے۔ وہ مومن کا ہتھیار ہے۔اس شخص میں کوئی خیر نہیں جو مال نہ جمع کرتا ہو۔ وہ شخص بہتر ہے جو مال جمع کرے، تاکہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے بچا رہے اوراس مال سے صلہ رحمی اور مالی حقوق کی ادائیگی کرے۔ ۲۱مالی فوائد کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ رقم طراز ہیں:

''یہ مال عبادات وطاعت کو درست رکھنے کا ذریعہ ہے، اسی سے حج وجہاد کا فریضہ انجام دیا جاتا ہے،اسی سے واجب اور مستحب انفاق ہوتا ہے،اسی سے گردنیں آزاد ہوتی ہیں، وقف،مساجد اور محلات تعمیر ہوتے ہیں، اسی مال سے نکاح ہوتا ہے، جو تنہائی میں نفلی عبادت سے افضل ہے۔اسی سے جود وسخا کی صفت کا اظہار ہوتا ہے،مال عزت کو محفوظ رکھتا ہے،مال ہی سے بھائی اور دوست ملتے ہیں،اسی سے نیکوکار لوگ بلند مقام تک پہنچتے ہیں اور انھیں ان لوگوں کی رفاقت نصیب ہوتی ہے جن پر اللہ نے انعامات کیے ہیں۔''۲۲

اسی بحث میں امام ابن قیمؒ نے کسبِ معاش کے فضائل اور فقر سے بچنے کے حوالے سے نبی ﷺ کی دعاؤں کا ذکر کیا ہے۔

امام غزالیؒ (م۵۰۵ھ) نے اپنی کتاب' احیاء علوم الدین' میں کسبِ معاش کی فضلیت،تجارت کے فضائل،حرام وحلال اور مالی حقوق کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔انھوں نے معاش کی فکر اور وابستگی کے اعتبار سے لوگوں کی تین قسمیں ذکر کی ہیں۔رقم طراز ہیں:

''رب کریم مُسببُ الاسباب منعم حقیقی نے آخرت کو دار الجزاء اور دنیا کو دار الامتحان قرار دیا ہے۔دنیا میں انسان محنت کرتا ہے، اس کی جزا آخرت میں ملتی ہے۔ دنیا کی محنت صرف یہی نہیں ہے کہ آدمی نماز روزے کے علاوہ کچھ نہ کرے، بلکہ یہ بھی آخرت کے اعمال کا اہم ترین حصہ ہے کہ زندگی کو گزارنے کے لیے کمائے۔اسی لیے کہا جاتا ہے کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔لوگ تین قسم کے ہیں: وہ جن کی معاشی تگ ودو نے ان کو اپنی آخرت سے غافل کر دیا ہے۔ یہ لوگ ہلاک ہوں گے۔ دوسرے وہ جو اپنی آخرت بنانے میں اتنے مشغول ہوئے کہ معاشی تگ و دَو سے غافل رہے۔ یہ لوگ کام یاب ہوکر رہیں گے۔ البتہ اعتدال کا راستہ تیسری قسم کے لوگوں کا طریقہ ہے، جنھوں نے معاشی تگ ودَو اپنی آخرت بنانے کے لیے کی۔ یہ درمیانی درجے کے لوگ ہیں۔''۲۳

عہد جدید کے ماہر معاشیاتِ اسلامی ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقیؒ (۱۹۳۱ء-۲۰۲۲ء)

نے اپنی کتاب 'معاش، اسلام اور مسلمان' میں مسلمانوں کی معاشی جدو جہد سے غفلت کے نتائج اور کسبِ معاش کے اسلامی نقطۂ نظر پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ وہ اس بات کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ مسلمانوں میں متعدد تحریکیں اٹھیں، لیکن کوئی ایک تحریک بھی معاشی بدحالی کو دور کرنے کے لیے کھڑی نہیں کی جاسکی۔ ان کا کہنا ہے کہ معاشی قوت کے بغیر دینی اور دنیوی دونوں کاموں میں کوئی نتیجہ خیز کام یابی نہیں مل سکتی ہے۔ رقم طراز ہیں:

''واقعہ یہ ہے کہ ادنیٰ ضروریات سے لے کر اعلیٰ ترین مقاصد حیات تک، ہر مقصد کا حصول وسائل کی موجودگی پر منحصر ہے۔ اگر کوئی پختہ عمر پر پہنچنے کے بعد دین کی خدمت کرنا چاہتا ہے، یا ملک وملت کے لیے کچھ کر دکھانے کا عزم رکھتا ہے تو اس کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ جوانی میں ہی اپنے کو اس قابل بنالے کہ اپنی ضروریات پوری کرنے کے بعد بھی کچھ وقت اور مال ان کاموں پر لگا سکے۔ کس کو کن کاموں کے لیے کتنا وقت ملتا ہے؟ اس کا انحصار صرف نیک ارادوں پر نہیں ہوتا، بلکہ اس کے لیے پہلے سے وسائل جمع کرنے پڑتے ہیں۔ بلاشبہ معاشی وسائل کی حیثیت صرف ذرائع کی ہے، ان کو مقاصد کا درجہ نہیں دینا چاہیے، مگر زندگی میں کوئی مقصد وسائل کے بغیر نہیں حاصل کیا جاسکتا ہے۔[۲۴]

## فقر وفاقہ

فقر وفاقہ کی زندگی عزت سے محروم کر دیتی ہے۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ نے غربت کی زندگی کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا ہے۔ غربت بسا اوقات انسان کو کفر کے دہانے تک پہنچا دیتی ہے۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: **كَادَ الفَقرُ أن يَّكُونَ كُفراً**[۲۵] ''غربت کبھی کفر تک پہنچا دیتی ہے۔'' آپؐ نے خود فقر وفاقہ کی زندگی سے پناہ مانگی اور امت کو اس سے بچنے کی تلقین کی ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

**تَعَوَّذُوا بِاللَّهِ مِنَ الْفَقْرِ، وَالْقِلَّةِ، وَالذِّلَّةِ، وَأَنْ تَظْلِمَ، أَوْ تُظْلَمَ**[۲۶]

''فقر، قلّت اور ذلّت سے اور ظلم کرنے اور کیے جانے سے اللہ کی پناہ مانگو۔''

آپؐ کی دعاؤں میں سے ایک یہ دعا بھی ہے: اَللّٰھُمَّ اِنِّی أعُوذُ بِکَ مِنَ الفَقرِ وَالفَاقَۃِ وَالذِّلَّۃِ وَأعُوذُ بِکَ أن اَظلِمَ أواُظلَمَ[۲۸] ''اے اللہ! میں فقر، قلّتِ مال اور ذلت سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور اس بات سے کہ کسی پر ظلم کروں یا کوئی مجھ پر ظلم کرے۔'' آپؐ نے دوسروں کو بھی یہ دعا مانگنے کی تلقین کی ہے۔

فقر و فاقہ اور محتاجی کی زندگی انسان کو مجبور و مقہور بنا دیتی ہے۔ وہ دینی اور دنیوی امور اچھے طریقے سے انجام نہیں دے سکتا۔ اس کیفیت میں بسا اوقات عام خیالات پراگندہ ہو جاتے ہیں، سوچنے سمجھنے کی قوت ماند پڑ جاتی ہے اور حرکت و عمل کی رفتار سست ہو جاتی ہے۔

## رزق میں اضافہ کی دعائیں

رزق انسان کی ایسی ضرورت ہے کہ اس کے بغیر زندگی کا تصور محال ہے۔ قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہ السلام نے بھی رزق کی طلب کے لیے اللہ سے دعائیں کی ہیں:

حضرت ابراہیمؑ اہل مکہ کے لیے رزق کی دعا کرتے ہیں۔ ارشاد باری ہے:

وَاِذْ قَالَ اِبْرَاھِیْمُ رَبِّ اجْعَلْ ھٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَھْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ (البقرۃ:۱۲۶)

''اور یہ کہ ابراہیمؑ نے دعا کی: ''اے میرے رب! اس شہر کو امن کا شہر بنا دے اور اس کے باشندوں میں جو اللہ اور آخرت کو مانیں، انھیں ہر قسم کے پھلوں کا رزق دے۔''

رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِکَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَۃً مِّنَ النَّاسِ تَھْوِیْٓ اِلَیْھِمْ وَارْزُقْھُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّھُمْ یَشْکُرُوْنَ (ابراھیم:۳۷)

''پروردگار! میں نے ایک بے آب و گیاہ وادی میں اپنی اولاد کے ایک حصے کو تیرے محترم گھر کے پاس لا بسایا ہے۔ پروردگار! یہ میں نے اس

لیے کیا ہے کہ یہ لوگ یہاں نماز قائم کریں، لہٰذا تُو لوگوں کے دِلوں کو ان کا مشتاق بنا اور انھیں کھانے کو پھل دے، شاید کہ یہ شکر گزار بنیں۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام بے سروسامانی کی حالت میں مصر سے جب مدین پہنچے تو انھوں نے رب سے رزق طلب کیا۔ ارشاد باری ہے:

رَبِّ اِنِّیۡ لِمَاۤ اَنۡزَلۡتَ اِلَیَّ مِنۡ خَیۡرٍ فَقِیۡر (القصص:۲۴)

''پروردگار! جو خیر بھی تو مجھ پر نازل کردے، میں اس کا محتاج ہوں۔''

دوسرے مقام پر ان کی دعا کے یہ الفاظ ہیں:

وَاکۡتُبۡ لَنَا فِیۡ ھٰذِہِ الدُّنۡیَا حَسَنَۃً وَّفِی الۡاٰخِرَۃِ اِنَّا ھُدۡنَاۤ اِلَیۡکَ

(الاعراف:۱۵۶)

''اور ہمارے لیے اس دنیا کی بھلائی بھی لکھ دیجیے اور آخرت کی بھی۔ ہم نے آپ کی طرف رجوع کرلیا۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام قوم کی فرمائش پر رزق کی دعا کرتے ہیں:

اللّٰھُمَّ رَبَّنَاۤ اَنۡزِلۡ عَلَیۡنَا مَآئِدَۃً مِّنَ السَّمَآءِ تَکُوۡنُ لَنَا عِیۡدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰیَۃً مِّنۡکَ وَارۡزُقۡنَا وَاَنۡتَ خَیۡرُ الرّٰزِقِیۡنَ (المائدۃ:۱۱۴)

''خدایا! ہمارے رب! ہم پر آسمان سے ایک خوان نازل کر، جو ہمارے لیے اور ہمارے اگلوں پچھلوں کے لیے خوشی کا موقع قرار پائے اور تیری طرف سے ایک نشانی ہو۔ ہمیں رزق دے اور تو بہتر رزق دینے والا ہے۔''

قرآن کریم کی یہ مشہور دعا بھی، جس کا نبی کریم ﷺ خاص طور پر اہتمام کرتے تھے، دنیا میں بھلائی اور طلبِ رزق کی طرف اشارہ کرتی ہے:

ربَّنَا آتِنَا فِیۡ الدُّنۡیَا حَسَنَۃً وَفِیۡ الآخِرَۃِ حَسَنَۃً وَقِنَا عَذَابَ النَّار (البقرۃ:۲۰۱)

''اے ہمارے رب! ہمیں دنیا کی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی دے اور آگ کے عذاب سے بچا۔''

مذکورہ بالا آیت میں 'حسنۃ' سے مراد امام خازنؒ (م۷۱۴ھ) کے نزدیک صحت،

امن، کفایت، خیر کی توفیق، دشمن کے مقابلے میں مدد، نیک اولاد اور نیک بیوی ہے۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ اس سے رزق حلال اور عمل صالح بھی مراد لیا جاتا ہے۔۳۰

امام طبریؒ (م۳۱۰ھ) نے 'حسنۃ' سے متعلق سلف کے متعدد اقوال نقل کیے ہیں۔ بعض اس سے علم وعبادت اور کتاب اللہ کا فہم لیتے ہیں اور بعض کے نزدیک اس سے مراد مال اور رزق طیب ہے۔۲۹ امام قرطبیؒ (م۶۷۱ھ) نے لفظ 'حسنۃ' پر جامع بات کہی ہے۔ رقم طراز ہیں:

وَالَّذِی عَلَیْهِ أَکْثَرُ أَهْلِ الْعِلْمِ أَنَّ الْمُرَادَ بِالْحَسَنَتَیْنِ نِعَمُ الدُّنْیَا وَالْآخِرَةِ .وَهَذَا هُوَ الصَّحِیحُ، فَإِنَّ اللَّفْظَ یَقْتَضِی هَذَا کُلَّهُ، فإن 'حَسَنَةً' نَکِرَةٌ فِی سِیَاقِ الدُّعَاءِ، فَهُوَ مُحْتَمِلٌ لِکُلِ حَسَنَةٍ مِنَ الْحَسَنَاتِ عَلَی الْبَدَلِ.وَحَسَنَةُ الْآخِرَةِ: الْجَنَّةُ بِإِجْمَاعٍ۳۰

''اکثر اہل علم کے نزدیک دونوں نیکیوں سے مراد دنیا اور آخرت کی نعمتیں ہیں اور یہی صحیح ہے، کیوں کہ لفظ یہ سب کچھ ظاہر کرتا ہے۔ 'حسنۃ' دعا کے ضمن میں نکرہ استعمال ہوا ہے۔ اس لیے اس میں ہر نیکی شامل ہے اور آخرت کی بھلائی متفقہ طور پر 'جنت' ہے۔''

رزق کے حوالے سے نبی ﷺ کی متعدد دعائیں کتب حدیث میں مذکور ہیں۔ ایک مشہور دعا درج ذیل ہے:

اللهُمَّ أَصْلِحْ لِی دِینِی الَّذِی هُوَ عِصْمَةُ أَمْرِی، وَأَصْلِحْ لِی دُنْیَایَ الَّتِی فِیهَا مَعَاشِی، وَأَصْلِحْ لِی آخِرَتِی الَّتِی فِیهَا مَعَادِی، وَاجْعَلِ الْحَیَاةَ زِیَادَةً لِی فِی کُلِّ خَیْرٍ، وَاجْعَلِ الْمَوْتَ رَاحَةً لِی مِنْ کُلِّ شَرٍّ۳۳

''اے اللہ! میرے دین کو سنوار دے، جو میری آخرت کے کام کا محافظ اور نگہبان ہے اور میری دنیا کو سنوار دے، جس میں میری روزی اور زندگی ہے اور میری آخرت کو سنوار دے، جس میں میری بازگشت ہے اور زندگی کو میرے واسطے ہر بہتری میں زیادتی کا سبب بنا دے اور موت کو میرے واسطے ہر ایک برائی سے راحت کا سبب بنا دے۔''

غزوۂ بدر کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرام کے لیے معاشی خوش حالی

کی دعا فرمائی تھی۔حضرت عبد بن عمروؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہﷺ نے یہ دعا کی تھی:

اللَّهُمَّ إِنَّهُمْ حُفَاةٌ فَاحْمِلْهُمْ، اللَّهُمَّ إِنَّهُمْ عُرَاةٌ فَاكْسُهُمْ، اللَّهُمَّ إِنَّهُمْ جِيَاعٌ فَأَشْبِعْهُمْ ۳۲

''اے اللہ! یہ لوگ پاپیادہ ہیں (یعنی سواری نہیں رکھتے) انھیں سواری مہیا کرا دے، پروردگار! یہ لوگ ننگے ہیں، انھیں لباس پہنا دے۔ پرودگار! یہ لوگ بھوکے ہیں، انھیں سیرابی عطا کردے۔''

اس دعا کا یہ نتیجہ نکلا کہ غزوۂ بدر میں مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی اور خوب مالِ غنیمت حاصل ہوا۔چنانچہ کوئی شخص ایسا نہیں تھا جسے ایک یا دو اونٹ مال غنیمت میں سے نہ ملے ہوں۔

مذکورہ دعائیں اس بات کی طرف رہ نمائی کرتی ہیں کہ رزق کی طلب اور جدّ و جہد کے ساتھ رزق میں اضافہ کی دعائیں کرنا بھی مومنانہ کردار ہے۔رزق کا حصول اور اس میں کشادگی کے لیے سعی و جہد کے ساتھ دعا بھی انبیاء کرام کا عمل رہا ہے۔رزق میں ترقی واضافہ کی خواہش اسلام کے منافی عمل نہیں ہے۔

## صلہ رحمی رزق میں اضافہ کا سبب

اسلام نے رزق میں اضافہ کے لیے متعدد اعمال کو مشروع قرار دیا ہے، جیسے صلہ رحمی۔ یہ ایسا عمل ہے جس سے رزق میں اضافہ ہوتا ہے۔صلہ رحمی کا منشا مسلم معاشرے میں اخوت، محبت، ہم دردی وغم خواری اور ایثار وقربانی کی فضا کو ہموار اور پروان چڑھانا ہے۔یہ عمل اللہ تعالیٰ کو اتنا محبوب ہے کہ اسے رزق اور عمر میں اضافہ کا ذریعہ قرار دیا ہے۔حضرت انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہﷺ نے فرمایا:

مَنْ أَحَبَّ أَنْ يُبْسَطَ لَهُ فِي رِزْقِهِ ، وَيُنْسَأَ لَهُ فِي أَثَرِهِ، فَلْيَصِلْ رَحِمَه ۳۳

''جس شخص کو یہ بات پسند ہو کہ اس کے رزق میں اضافہ ہو اور اس کی عمر دراز ہو تو اسے چاہیے کہ صلہ رحمی کرے۔''

صلہ رحمی سے رزق میں کیسے اضافہ ہوتا ہے؟ اور اس کا رزق سے کیا تعلق

ہے؟ بہ ظاہر یہ سوال عجیب معلوم ہوتا ہے، لیکن غور کریں تو اس کی متعدد وجوہ سمجھ میں آتی ہیں۔ صلہ رحمی کرنے والے شخص کو ہم دردی حاصل ہوتی ہے، نیک دعائیں نصیب ہوتی ہیں، لوگ ایسے شخص کا ہر ممکن تعاون کی کوشش کرتے ہیں، اسے نیک مشورے ملتے ہیں۔ چنانچہ یہ چیزیں اس کے لیے رزق کے دروازے کھول دیتی ہیں، ساتھ ہی اس کے نتیجے میں اس پر اللہ کی عنایات اور رحمتوں کا سلسلہ جاری ہوجاتا ہے۔

## زکوٰۃ وصدقات کے حکم کا منطقی نتیجہ

قرآن کریم میں زکوٰۃ کی ادائیگی کو لازمی قرار دیا گیا ہے اور ساتھ ہی صدقہ وخیرات پر ابھارا گیا ہے اور اس پر جزا کا وعدہ کیا گیا ہے۔ ارشاد باری ہے:

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمُ ابْتِغَاء مَرْضَاتِ اللّهِ وَتَثْبِيتاً مِّنْ أَنفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ أَصَابَهَا وَابِلٌ فَآتَتْ أُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ فَإِن لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ وَاللّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيْر (البقرۃ:۲۶۵)

''اور جو لوگ اپنے مال محض اللہ کی رضا جوئی کے لیے دِل کے پورے ثبات وقرار کے ساتھ خرچ کرتے ہیں، اُن کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے کسی سطح مرتفع پر ایک باغ ہو، اگر زور کی بارش ہوجائے تو دُوگنا پھل لائے اور اگر زور کی بارش نہ بھی ہو تو ایک ہلکی پُھوار ہی اس کے لیے کافی ہوجائے۔ تم جو کچھ کرتے ہو، سب اللہ کی نظر میں ہے۔''

اسلام اپنے ماننے والے کو خوش حال دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کا منشا یہ ہے کہ وہ معاشرے میں خود دار اور خود کفیل زندگی گزارے، تنگ دستی اور مالی بدحالی کا شکار نہ ہو۔ وہ لینے والا نہ بنے، دینے والا بنے، خرچ کرنے والا ہو، خرچ لینے والا نہ ہو۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ معاشی تگ ودو کردے، ضروریات زندگی کی فراہمی کے لیے ذریعۂ معاش اختیار کرے، محنت ومزدوری کرے، ممکن ہو تو تجارت وصنعت سے وابستہ ہو، بہر کیف جو ذریعۂ معاش ممکن ہو اسے اختیار کرے۔

## کتبِ حدیث وفقہ میں مالی معاملات کی تفصیلات

اسلام نے معاشی زندگی کو کتنی اہمیت دی ہے اس کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ حدیث وفقہ کی کتابوں میں مالی معاملات کو نہایت شرح وبسط کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔امام بخاریؒ (م۲۵۶ھ) نے اپنی 'صحیح' میں کتاب البیوع، کتاب السلم ، کتاب الشفعۃ، کتاب الاجارۃ، کتاب الحوالات، کتاب الکفالۃ، کتاب الوکالۃ، کتاب المزارعۃ، کتاب المساقاۃ اور کتاب الشرکۃ وغیرہ میں مالی معالات کی تمام تفصیلات کا احاطہ کیا ہے۔ اسی طرح امام مسلمؒ (م۲۶۱ھ) نے اپنی 'صحیح' میں کتاب البیوع اور کتاب المساقاۃ میں ذرائع معاش کے اصول وآداب کا ذکر کیا ہے۔حدیث کی دیگر کتابوں: سنن ابی داؤد، سنن ترمذی، سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ میں بھی مالی امور کی تفصیلات زیر بحث آئی ہیں اوران سے متعلق رسول اللہ ﷺ کے ارشادات نقل کیے گئے ہیں۔

فقہ کی مشہور کتابوں: سرخسی (م۴۸۳ھ) کی 'المبسوط' ،علاؤ الدین کاسانی حنفیؒ (م۵۸۷ھ) کی 'بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع'،ابن رشدؒ (م۵۹۵ھ) کی 'بدایۃ المجتہد و نہایۃ المقتصد' ،ابومحمد الحسین بن مسعود البغویؒ (م۵۱۶ھ) کی 'التہذیب فی فقہ الإمام الشافعی'، ابن قدامہؒ (م۶۲۰ھ) کی 'المغنی'،عبدالسلام بن عبداللہؒ (م۶۵۲ھ) کی 'المحرر فی الفقہ علی مذہب الإمام أحمد بن حنبل' میں معاملات کی جزئیات سے متعلق تفصیلی بحث موجود ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اسلام نے انسان کی معاشی زندگی سے خاطر خواہ بحث کی ہے،اور اس کو خوش حال بنانے کے لیے ذرائع معاش، آداب کسبِ معاش اور مصارفِ معاش کو نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے۔اسلام انسانوں کو خوش حال دیکھنا چاہتا ہے، چنانچہ انھیں مال میں اضافہ کی متعدد راہیں دکھاتا ہے۔ مال یقیناً انسان کے دنیوی اور دینی امور کی انجام دہی میں بے حد ممدّ ومعاون ہوتا ہے۔مال کمانا معیوب نہیں ہے، بلکہ اس کی محبت میں گرفتار ہونا سخت ناپسندیدہ ہے۔ مال کی ایسی محبت کہ انسان اپنے فرائض سے غافل ہو جائے، حرام اور حلال کی تمیز کھو بیٹھے اور اخلاقی حدود سے تجاوز کر جائے، اس پر اللہ کی سخت وعید ہے۔

## حواشی ومراجع


۱- محمد بن عیسیٰ ترمذی، سنن ترمذی، أبواب صفۃ القیامۃ والرقائق والورع عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، باب فی القیامۃ، حدیث: ۲۴۱۶

۲- مسلم بن الحجاج، صحیح مسلم، کتاب النکاح، باب استحباب النکاح لمن تاقت نفسہ إلیہ، حدیث: ۱۴۰۱

۳- ابواسحاق الشاطبی، الموافقات فی اصول الشریعہ، دار ابن عفان، ۱۹۹۷ء، ج ۲، ص: ۲۸۴

۴- ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب، سنن النسائی، کتاب الزینۃ، باب الجلاجل، حدیث: ۵۲۲۴

۵- ابوجعفر احمد بن محمد المعروف بالطحاوی، شرح مشکل الآثار، تحقیق: شعیب الأرنؤوط، مؤسسۃ الرسالۃ، ۱۹۹۴ء ج ۱۵، ص: ۳۲۸

۶- صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب تخوف ما یخرج من زھرۃ الدنیا، حدیث: ۱۰۵۲

۷- ابوعبداللہ محمد بن یزید ابن ماجہ، سنن ابن ماجہ، أبواب التجارات، باب الحث علی المکاسب، حدیث: ۲۱۴۱

۸- احمد بن الحسین، السنن الکبری، البیہقی، کتاب الإجارۃ، باب کسب الرجل وعملہ بیدیہ، حدیث: ۱۱۶۹۵ [ضعفه الألبانی]

۹- ابوعبداللہ احمد بن محمد، مسند امام احمد بن حنبل، مؤسسۃ الرسالۃ، ۲۰۰۱ء، مسند الشامیین، حدیث: ۱۷۲۶۵

۱۰- صحیح البخاری، کتاب البیوع، باب کسب الرجل وعملہ بیدیہ، حدیث: ۲۰۷۲

۱۱- سلیمان بن احمد الطبرانی، المعجم الأوسط، دار الحرمین، قاہرہ، ۱۹۹۵ء، ج ۱، ص: ۳۸، حدیث: ۱۰۲ [ضعفه الألبانی]

۱۲- صحیح البخاری، کتاب البیوع، باب کسب الرجل وعملہ بیدیہ، حدیث: ۲۰۷۴

۱۳- سلیمان بن احمد طبرانی، مسند الشامیینؒ، تحقیق: حمدی بن عبد المجید السّلفی، مؤسسۃ الرسالۃ - بیروت، ۱۹۸۴ء، حدیث: ۳۴۶۵ [ضعّفه الألبانی]

۱۴- ابوداؤد سلیمان بن اشعث، سنن أبی داود، کتاب الزکاۃ، باب کراھیۃ المسألۃ، حدیث: ۱۶۴۳

۱۵- صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب بیان أن الید العلیا خیر من الید السفلی، وأن الید العلیا ہی المنفقۃ وأن السفلی ھی الآخذۃ، حدیث: ۱۰۳۳

۱۶- صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب کراھیۃ المسألۃ للناس، حدیث: ۱۰۴۰

۱۷- سنن ابی داؤد، کتاب الزکوۃ، باب ما تجوز فیہ المسألۃ، حدیث:۱۶۴۱[ضعّفه الألبانی]
۱۸- المعجم الکبیر للطبرانی، مکتبۃ ابن تیمیۃ، القاہرۃ، الطبعۃ الأولی، ۱۹۹۴ء، باب الکاف، جزء ۱۹، حدیث:۲۸۲
۱۹- امام محمد بن الحسن الشیبانی، کتاب الکسب، مکتبۃ المطبوعات الاسلامیۃ حلب، ۱۹۹۷، ص:۸۱
۲۰- حوالہ سابق، ص:۷۵-۷۸
۲۱- امام بن قیم الجوزیۃ، عدۃ الصابرین وذخیرۃ الشاکرین، تحقیق: اسماعیل بن غازی مرحبا، دار عالم الفوائد، ۱۴۲۹ھ، ص:۴۹۹
۲۲- حوالہ سابق، ص:۵۰۲
۲۳- أبو حامد محمد بن محمد الغزالی، إحیاء علوم الدین، دار المعرفۃ - بیروت، ۱۹۸۲ء، ج ۲، ص ۶۰-۶۱
۲۴- معاش، اسلام اور مسلمان، محمد نجات اللہ صدیقی، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی، ۲۰۰۹ء، ص ۴۰
۲۵- احمد بن الحسین البیہقی، شعب الایمان، باب الحث علی ترک الغل والحسد، حدیث:۸۸۱۶
۲۶- سنن نسائی، کتاب الاستعاذۃ، باب الاستعاذۃ من الذلۃ، حدیث:۵۴۶۳
۲۷- سنن ابو داؤد، کتاب تفریع ابواب الوتر، باب فی الاستعاذۃ، حدیث:۴۴۵۱
۲۸- علاء الدین علی بن محمد المعروف بالخازن، لباب التأویل فی معانی التنزیل، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۴۱۵ھ، ج ۱، ص:۱۳۴
۲۹- محمد بن جریر، جامع البیان فی تأویل القرآن، مؤسسۃ الرسالۃ بیروت، ۲۰۰۰ء، جلد ۴، ص:۲۰۵
۳۰- أبو عبد اللہ محمد بن أحمد المعروف بالقرطبی، الجامع لأحکام القرآن المعروف بہ تفسیر القرطبی، دار الکتب المصریۃ، القاہرۃ ۱۹۶۴ء، جلد ۲، ص:۴۳۲-۴۳۳
۳۱- صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبۃ والاستغفار، باب التعوذ من شر ما عمل ومن شر ما لم یعمل، حدیث:۲۷۲۰
۳۲- سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، باب فی نفل السریۃ تخرج من العسکر، حدیث:۲۷۴۷
۳۳- صحیح مسلم، کتاب الادب، باب من بسط لہ فی الرزق، حدیث:۵۹۸۶

# تفسیروں میں اسرائیلی روایات

## (مولانا اسیر ادرویؒ کی کتاب کا مطالعہ وتجزیہ)

پروفیسر ابوسفیان اصلاحی

اسرائیلیات یا اسرائیلی روایات کے خلاف شدّ ومد کے ساتھ آواز اٹھتی رہی ہے۔ مفسرین اور محققین اس کے مضر اثرات کی نشان دہی کرتے رہے ہیں۔ ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں اسرائیلی رواۃ کے مذموم ارادوں اور اسرائیلی نصوص سے مدلل آگاہی فراہم کی ہے۔ اسرائیلیات کے راویوں نے اپنے جن ناپاک عزائم کو عملی جامہ پہنایا، اسی کی ہم نوائی عیسائیوں نے بڑی خاموشی سے بھرپور انداز میں کی ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ان کی خفیہ سازشوں سے صحابۂ کرام کو باخبر کیا اور اسرائیلی روایات کو بیان کرنے سے منع کیا۔ حضرت عمرؓ نے جب مجموعۂ اسرائیلیات پڑھنے کا ارادہ کیا تو آپ نے اس پر شدید برہمی کا اظہار کیا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک ایسی کتاب عطا کی ہے جو تمام نقائص اور شکوک وشبہات سے پاک ہے۔ صحابہ کرامؓ نے اس فتنہ کے نقصانات کی جانب اشارہ کیا ہے۔ اسرائیلی روایات سے انبیاء کرام کی عصمت وعظمت پر براہ راست ضرب پڑتی ہے۔ خود اللہ کے رسول ﷺ کے وقار پر حرف آتا ہے۔ کتبِ احادیث میں بھی ان اسرائیلیات نے اپنی جگہ بنالی اور مفسرین نے اپنی تفاسیر میں انھیں نقل کرنا شروع کردیا۔ چنانچہ اسرائیلیات کا تداول نہ صرف یہ کہ امتِ مسلمہ میں باقی رہا، بلکہ وہ اس کے باشعور طبقہ کے لیے بھی قابل التفات رہیں۔ اس بنا پر کتابوں میں انہیں نقل کیا جاتا رہا۔ امت کے بعض معروف حلقوں میں ان کے مفسدانہ مواد کی تاویلات ہوتی

رہیں اور ان کی روشنی میں قرآن کریم کے بہت سے واقعات کی تفسیر کی جاتی رہی۔ مثلاً قصۂ آدم وشیطان، قصۂ یوسف اور سفینۂ نوح کے حوالے سے بے سروپا کہانیاں تفاسیر میں موجود ہیں، جن کا مآخذ یہی اسرائیلیات ہیں۔ اربابِ تاویل کو یہ خیال نہیں رہا کہ قرآن کریم قطعی الدلالۃ ہے، اس کی تفسیر ایسی بے سروپا روایات سے کرنا درست نہیں۔ اسرائیلیات میں ایسی خرافات ہیں جنھیں اللہ کے رسول ﷺ سے جوڑتے ہوئے جسم وجان پر ارتعاشی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔

اسرائیلیات کے اثرات نے قابلِ ذکر اسلامی مفکرین کو متأثر کیا ہے۔ کتبِ تفسیر کے علاوہ مختلف اصناف میں اسرائیلیات کی رسائی دیکھی جاسکتی ہے۔ خلقِ قرآن کا مسئلہ اسرائیلیات کی دین ہے۔ یہ خیال بھی اسرائیلی روایات کے زیر اثر ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر سحر نے اپنا اثر دکھایا تھا۔ پروفیسر الطاف احمد اعظمی نے اپنی تفسیر 'میزان القرآن' میں اس کی تردید کی ہے۔ انھوں نے مفسرین کے اس خیال کو بے بنیاد بتایا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ پر سحر کا اثر ہوا تھا۔[۱] تعمیر کعبہ کے حوالے سے بہت سی اسرائیلی روایات موجود ہیں۔ سرسید نے 'خطباتِ احمدیہ' میں تعمیر کعبہ کے تعلق سے مفید گفتگو کی ہے۔[۲] اسی طرح اصحابِ کہف یا اصحاب الرقیم کے ضمن میں اسرائیلیات نے ایک نیا افسانوی طرز ایجاد کیا ہے۔ اس کی تردید سرسید احمد خاں نے اپنی کتاب 'ترقیم قصہ اصحاب الکہف والرقیم' میں کی ہے۔[۳] راقم نے اپنے ایک مضمون میں اس کا جائزہ لیا ہے۔[۴] حجر اسود کے بارے میں بھی بہت سی اسرائیلی روایتیں ہیں، جن کی تردید سرسید نے 'خطباتِ احمدیہ' میں کی ہے۔[۵] قصص القرآن کے باب میں سرسید نے بعض نامناسب باتیں کہی ہیں، لیکن اسرائیلیات کے خلاف وہ شمشیر برہنہ نظر آتے ہیں۔ ان کی تفسیر میں اسرائیلیات کا گزر نہیں ہے، کیوں کہ وہ اسرائیلیات کی ضرر رسانی سے بخوبی واقف تھے۔

یہاں یہ صراحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ ہندوستان میں جن اربابِ علم نے اسرائیلیات کی تردید میں مدلل طرز اختیار کیا ہے ان میں ایک نمایاں نام مولانا حمیدالدین فراہیؒ کا ہے۔ ان کی تصنیف 'الرأی الصحیح فیمن ھو الذبیح' کے تمام

مباحث اسرائیلیات کی تردید میں لکھے گئے ہیں۔اس کتاب کا اصل موضوع تو یہ ہے کہ ذبیح حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں نہ کہ حضرت اسحٰق علیہ السلام، لیکن ساتھ ہی اس میں صفا ومروہ، مقام قربانی اور حقیقتِ مکہ پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔ یہود نے اپنی کتابوں میں مذکورہ حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے۔مولانا نے کتب مقدسہ،قرآن کریم اور احادیث کی روشنی میں ان کی تردید کی ہے۔[۶]

عہد حاضر کے علماء کرام میں ایک قابل ذکر نام مولانا اسیر ادرویؒ کا ہے، جنھوں نے کتبِ تفسیر کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے بتایا ہے کہ مفسرین نے بہت سی اسرائیلیات کو اپنی تفاسیر میں جگہ دی ہے، جولغویات پر مشتمل ہیں۔ان میں انبیاء کرام کی معصومیت کو تارتار کیا گیا ہے۔مولانا نے اپنی کتاب 'تفسیروں میں اسرائیلی روایات' میں انتالیس (۳۹) عناوین کے تحت گفتگو کی ہے۔انہوں نے مختلف آیات اور قرآنی قصص کے تحت اسرائیلیات کا تحلیل وتجزیہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ یہ مضامین کبھی احادیث کا حصہ نہیں ہوسکتے۔ان کا تفسیرِ آیات سے کوئی علاقہ نہیں ہے، بلکہ یہ جسارت بے جا ہے کہ اس کا سلسلہ اللہ کے رسول ﷺ سے جوڑا جائے۔مولانا نے اسناد پر گفتگو کرتے ہوئے ان کے ضعف پر روشنی ڈالی ہے۔اسرائیلیات کو باوزن بنانے کے لیے راویوں کے درمیان بعض جلیل القدر صحابہ کرامؓ کے اسماء گرامی ڈال دیے گئے ہیں، تاکہ قارئین کو اعتماد میں لیا جاسکے۔مولانا ادروی نے اسے کذب وافترا کا نام دیا ہے۔مولانا نے ان اسرائیلیات کی زہر افشانیوں کا پردہ فاش کرتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ ان کا تفسیرِ آیات سے کوئی جوڑ نہیں ہے۔انہوں نے یہودیت کو اسرائیلیات کا اصل سرچشمہ قرار دیا ہے۔ یہ دراصل ایک تحریک ہے جو اسلام کے خلاف چھیڑی گئی ہے۔آج اس میں عیسائیت اور دنیا کے بہت سے دیگر ملک وملت کے لوگ بھی شامل ہیں۔ ہندوستان کی مختلف تنظیمیں اس تحریک کو تقویت دے رہی ہیں۔ یہودیت، عیسائیت اور ہندوستان کی فسطائیت نہ صرف دین اسلام کی تصویر کو مسخ کرنے پر تُلی ہوئی ہیں، بلکہ امت مسلمہ کا دائرۂ حیات دن بہ دن تنگ کرنے میں مصروف ہیں۔اسی کا جدید نام تحریک استشراق ہے۔[۸]

مولانا نے یہودیت کے اس توسع کو ان الفاظ میں دیکھنے کی کوشش کی ہے:

''اسلامی اصطلاح میں جہاں ان روایتوں پر 'اسرائیلیات' کا لفظ بولا جاتا ہے جن کا سرچشمہ یہودیت ہے، وہیں اُن واقعات وقصص پر بھی اس کا اطلاق ہونے لگا ہے جن کا اصل سرچشمہ یہودیت نہیں، بلکہ ان روایتوں کو وضع کرنے والے منافقین یا مشرکین یا نصاریٰ رہے ہیں، جیسے قصۂ غرانیق ہے، جو درحقیقت یہودیوں کی افسانہ تراشی نہیں ہے، بلکہ بہ قول محمد اسحاق جامع السیر ۃ النبویۃ زندیقیوں کا گھڑا ہوا افسانہ ہے، اسی طرح زینب بنت جحشؓ کا واقعہ بھی مشرکین عرب کا گھڑا ہوا ہے، لیکن اصطلاح میں ان روایتوں کو بھی اسرائیلیات میں شمار کیا گیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اسرائیلیات کا لفظ اب زیادہ وسیع مفہوم میں استعمال ہونے لگا ہے، جو واقعات وحوادث یہودیت کے ذہن ومزاج اور رنگ کے ہیں، چاہے وہ اسرائیل کے وضع کردہ نہ ہوں، لیکن ان واقعات میں یہودیت کا رنگ جھلکتا ہے، اس لیے اصطلاحاً ان کو بھی 'اسرائیلیات' ہی کہا گیا ہے''۔ [۷]

مولانا اسیر ادروی کی یہ کتاب علمی وتحقیقی اعتبار سے اعلیٰ نوعیت کی ہے۔ یہ مندرجہ موضوعات پر محیط ہے: قصۂ حضرت آدم علیہ السلام، ہاروت وماروت، بناء کعبہ اور حجر اسود، تابوت اور سکینہ، حضرت داؤد علیہ السلام کا جالوت کو قتل کرنے کا واقعہ، عوج بن عنق، ہابیل وقابیل، نزول مائدہ، کوہ طور اور تجلیٔ ربانی، تورات کی تختیاں، غضب موسیٰ اور القاء الواح، بنی اسرائیل، آدم وحوا اور نسبت شرک، کشتیٔ نوح، قصۂ حضرت یوسف، بنی اسرائیل کی فساد انگیزی، اصحابِ کہف، ذوالقرنین، یاجوج ماجوج، الغرانیق العلیٰ، بلقیس ملکۂ سبا، واقعۂ زینب بنت جحشؓ، ذبیح کون ہے؟، حضرت الیاس علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام، حضرت ایوب علیہ السلام، کوہ قاف، بہموت مچھلی، جنت شداد، مسخ صورت، عصا موسیٰ، جہنم کی ایک وادی، جنت کا ایک منظر اور بھیڑیے کی گواہی۔ یہ وہ موضوعات ہیں جن کے تعلق سے مولانا نے اسرائیلیات کی

افترا پردازیوں کو طشت از بام کیا ہے۔ اس کتاب کا حقیقی کردار اور محاکمہ یہ ہے کہ اس میں قرآن کریم کے حقیقی مقاصد کا ذکر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ قرآنی مفاہیم اور اسرائیلیات میں تضاد ہے، بلکہ عمداً کوشش کی گئی ہے کہ اسرئیلیات کے ذریعہ قرآن کریم کے مطلوبہ مناہج سے عامۃ الناس کی نظروں کو ہٹا دیا جائے۔ مذکورہ تمام مباحث کا خلاصہ یا تجزیہ ممکن نہیں ہے، صرف چند عناوین کو پیش نظر رکھتے ہوئے کتاب کی قدر و قیمت اور مرتب کے تحقیقی کام کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی جائے گی۔

## کشتیٔ نوح

کشتیٔ نوح علیہ السلام کے حوالے سے اسرائیلیات نے لایعنی خیالات کا ڈھیر لگا دیا ہے، جس کا عقل وخرد سے کوئی واسطہ نہیں ہے، بلکہ طلسم ہوش ربا کی اساطیری پیش کش کو بھی پس پشت ڈالنے کی اختراعی کوشش ہے۔ قرآن کریم دراصل کتابِ تفکر ہے۔ وہ انسانوں کے ذہن وفکر کو مختلف حوالوں سے جھنجھوڑتا ہے، تاکہ خلق خدا کو خالق کائنات کی معرفت حاصل ہو اوران کے اندر اس کے احکام پر عمل کرنے کا جذبہ پایا جائے۔ کشتیٔ نوح کے حوالے سے ارشاد ربانی ہے: فَكَذَّبُوهُ فَأَنجَيْنَاهُ وَالَّذِينَ مَعَهُ فِي الْفُلْكِ۔ (الاعراف: ۷/۶۴) ''سو وہ لوگ ان کی تکذیب ہی کرتے رہے تو ہم نے نوح کو اور ان کو جو ان کے ساتھ تھے، کشتی سے بچالیا۔'' اس آیت کریمہ میں سفینۂ نوحؑ کا ذکر ہے۔ اس کے تناظر میں بے بنیاد مباحث کا طومار ہے، جس پر مولانا نے یوں تبصرہ کیا ہے:

> ''طوفانِ نوح یا کشتیٔ نوح قرآنی حقیقتیں ہیں۔ قرآن میں متعدد مقامات پر ان کا تذکرہ ہے، لیکن بعض تفسیروں میں اسرائیلی روایتوں کا اتنا انبار جمع کر دیا گیا ہے کہ حقیقت خرافات میں کھو گئی ہے اور کشتی نوح ایک بے حقیقت افسانہ بن گئی ہے۔ درجنوں روایتیں ہیں، جو مبالغہ آرائی، عجوبہ کاری اور حیرت انگیزی میں ایک دوسرے سے بڑھ کر ہیں۔ ایسے دیومالائی واقعات بیان کیے گئے ہیں کہ اگر ان روایات کو اسلام کی صحیح، حقیقی اور مستند روایات تسلیم کرلیا جائے تو آج کی ترقی یافتہ

دنیا میں اسلام مجموعۂ خرافات وتوہمات بن کر رہ جائے۔'' ۸

کشتیٔ نوح کے سلسلے میں بہت سی روایات ہیں، جن کا صداقت سے کوئی علاقہ نہیں۔ ذیل میں چند روایات کی ایک جھلک پیش کی جاتی ہے:

''ابن مردویہ نے عبداللہ بن عباسؓ کی ایک روایت نقل کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ حضور ﷺ نے فرمایا: نوح علیہ السلام کی کشتی کے بہت سے پَر تھے اور ان پَروں کے نیچے محلات تھے۔ ابن مرویہ نے سمرہ بن جندب سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سام ابوالعرب ہیں اور حام ابوالحبش اور یافث ابوالروم ہیں اور آپ نے بتایا کہ کشتی کی لمبائی تین سو ہاتھ اور چوڑائی پچاس ہاتھ اور اونچائی تیس ہاتھ تھی اور اس کا دراوازہ عرض میں تھا۔ اسحٰق بن بشیر نے ابن عساسے ،انھوں نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا: جب حضرت نوحؑ کو کشتی بنانے کا حکم ملا تو انھوں نے اللہ تعالیٰ سے کہا: لکڑی کہاں ہے، جس سے کشتی بنائی جائے؟ اللہ تعالیٰ نے کہا: درخت لگاؤ۔ حضرت نوحؑ نے ساگوان کے درخت لگوائے اور بیس سال تک ان کے بڑے ہونے کا انتظار کرتے رہے۔ جب ان کے تنے اتنے بڑے اور موٹے ہوگئے کہ اس کے تختے بنا کر کشتی بنائی جائے، تب آپ نے کشتی بنوانی شروع کی۔ یہ کشتی چھ سو ہاتھ لمبی تھی، ساٹھ ہاتھ اس کی گہرائی تھی اور اس کی چوڑائی تین سو تینتیس ہاتھ تھی۔ کشتی تیار ہونے کے بعد اللہ نے حکم دیا کہ اس پر تارکول لگاؤ۔ زمین میں تارکول کا کوئی چشمہ نہیں تھا۔ اللہ نے اسی مقام پر، جہاں کشتی بن رہی تھی، تارکول کا ایک چشمہ پیدا کر دیا۔ وہ چشمہ کھولنے لگا اور تارکول رقیق ہوکر استعمال کے لائق ہوگیا، تب کشتی پر لگایا گیا۔'' ۹

مذکورہ بیانات سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کشتیٔ نوح کی تیاری میں ان رواۃ نے حصہ لیا ہو اور اس کے کیل کانٹے ان کے سامنے لگائے گئے ہوں۔ تفسیر ابن جریر میں نقل کردہ ایک روایت کے الفاظ اس طرح ہیں:

''کشتی کی لمبائی ۱۲۰۰/ ہاتھ تھی اور اس کی چوڑائی ۶۰۰/ ہاتھ تھی۔ اس

کے تین درجے تھے: ایک طبقہ میں چوپائے اور وحشی جانور تھے۔ ایک طبقہ میں انسان تھے اور ایک طبقہ میں چڑیاں تھیں۔ جس طبقہ میں جانور تھے اس میں گوبر، لید اور پاخانے بھر گئے تو اللہ نے نوح کے پاس وحی بھیجی کہ ہاتھی کی دم پکڑ کر زور سے ہلاؤ۔ حضرت نوحؑ نے ہاتھی کی دم پکڑ کر زور سے کھینچا تو ہاتھی میں سے ایک جوڑا سور نر اور مادہ گر پڑے اور دونوں باہر آتے ہی غلاظتوں پر ٹوٹ پڑے اور چٹ کر گئے۔ کشتی میں رہنے والے چوہوں نے شرارت شروع کردی۔ وہ کشتی کی لکڑی کو کُترتے جاتے تھے، جس سے کشتی خراب ہوتی رہی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ کے پاس وحی بھیجی کہ شیر کی دونوں آنکھوں کے بیچ پیشانی پر ٹھوکر مارو۔ جب حضرت نوحؑ نے ٹھوکر ماری تو اس کے حلق سے ایک بلی اور ایک بلاّ نکل پڑے۔ نکلتے ہی دونوں چوہوں پر پل پڑے اور ان کا صفایا کردیا۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ شیر کی چھینک سے بلیاں اور ہاتھی کی چھینک سے سور نکلے تھے۔'' [۱۰]

ابن جریر نے جس روایت کو نقل کیا ہے وہ جھوٹ کا پلندہ ہے۔ کشتیٔ نوح کو افسانوی رنگ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی روایت میں ایسے مضامین بھی ہیں جس میں شرم وحیا کے حدود کا کوئی پاس ولحاظ نہیں ہے۔ اسرائیلیات کے فن کاروں نے مختلف بے بنیاد باتوں سے تفسیر آیات کو افسانوی رنگ دینے کی کوشش کی ہے، قرآن کریم کے سنجیدہ اور فکری مباحث کو بازیچۂ اطفال بنادیا ہے۔ اسرائیلیات کے ڈھیر میں انسان قرآن کریم کے حقیقی مقصد سے بھٹک جاتا ہے۔ اس کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو:

'' بکری بھی آئی۔ کشتی کا دروازہ اونچا تھا، اس کے لیے سوار ہونا مشکل تھا۔ حضرت نوحؑ نے اس کی دم پکڑ کر کشتی میں ڈھکیلا تو اس کی دم ٹوٹ گئی۔ اسی وجہ سے اس کی شرم گاہ کھلی رہ گئی اور آج تک کھلی ہوئی ہے۔ جب بھیڑ آئی تو بغیر کسی زحمت کے کشتی میں سوار ہوگئی۔ حضرت نوحؑ نے اس کی دم پر شفقت سے ہاتھ پھیر دیا۔ اس لیے اللہ نے اس کی شرم گاہ کو دم سے چھپادیا''۔ [۱۱]

مولانا اسیر ادروی نے مزید روایات بھی نقل کی ہیں۔ایک روایت میں ہے کہ کشتیٔ نوح نے بیت اللہ کا سات مرتبہ طواف کیا۔ایک دوسری روایت میں ہے کہ اس کشتی کی تیاری میں ساگوان کے بجائے شمشاد کے درخت کی لکڑیاں استعمال کی گئی تھیں۔ان درختوں کی کٹائی میں حضرت نوحؑ کے تینوں بیٹوں حام، سام، اور یافث نے مدد کی۔کشتیٔ نوح کی تیاری کی مدت کے حوالے سے مختلف اقوال ہیں: ایک قول یہ ہے کہ چالیس سال میں تیار ہوئی، بعض دوسری روایتوں میں ساٹھ سال کا ذکر ہے، ایک رائے یہ ہے کہ سو سال اس کی تیاری میں صرف ہوئے اور ایک بیان یہ بھی ہے کہ یہ کشتی ۴۰۰ رسال میں بن کر تیار ہوئی۔مولانا اسیر ادروی نے ان روایات پر یوں تبصرہ کیا ہے:

> ''سب سے بہتر اور صحیح رائے یہی ہے کہ ان لغویات وخرافات، بیہودہ اور مضحکہ خیز توہمات اور قیاس آرائی سے قطع نظر کرلیا جائے اور صرف اُنہی باتوں پر ایمان لایا جائے جتنا قرآن نے ہمیں بتایا ہے۔اس کی لمبائی، چوڑائی، اونچائی، گہرائی، اس کی لکڑی کی جانچ کہ کہاں بنی؟ کتنے دن میں بنی؟ وغیرہ وغیرہ، جسے اللہ کی کتاب نے نہیں بیان کیا ہے، نہ احادیث صحیحہ میں کوئی تشریح ہے تو کون سی مجبوری ہے کہ اس کی کرید اور تحقیق میں پڑا جائے۔'' [۱۲]

## اصحابِ کہف

اصحاب کہف کے تعلق سے اللہ کا ارشاد ہے:

إِذْ اَوَى الْفِتْيَةُ إِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوا رَبَّنَا آتِنَا مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً وَهَيِّءْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَداً۔(الکہف:۱۰)

(ان چند نوجوانوں نے جب غار میں پناہ لی تو دعا کی: اے ہمارے پروردگار! ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا فرما اور ہمارے کام میں ہمارے لیے راہ یابی کو آسان کردے۔)

اصحاب کہف کون تھے؟ قرآن کریم سے پتا چلتا ہے کہ یہ اللہ کے کچھ نیک بندے تھے، جو خود کو بت پرستوں اور مشرکین سے دوٗر رکھنا چاہیے تھے۔ان کا بادشاہ ظالم

اور غالی بت پرست تھا۔اس سے علیٰحدگی کا مفہوم یہی ہے کہ خود کو جلاوطن کرلیا جائے۔ چنانچہ ان پاک باز بندوں نے خود کو اپنی سوسائٹی، اپنے لوگوں اور اپنے وطن سے جدا کرکے کسی غار میں قید کرلیا۔ سرسید نے اپنی کتاب 'ترقیم قصۃ اصحاب الکہف والرقیم' میں اصحابِ کہف پر عالمانہ اظہار خیال کیا ہے اور روایاتی خرافات پر تنقید کی ہے۔مولانا ادروی نے ان کی تحقیق سے استفادہ نہیں کیا ہے۔[۱۳] سرسید کی تحقیقات نقائص سے پاک نہیں ہیں، لیکن ان کی کتاب میں بعض ایسے جواہر اور قیمتی نکات ہیں جو محققین اور مفسرین کے یہاں نہیں ملتے، لیکن افسوس کہ اسلامی حلقہ ان کی نگارشات کا معروضی مطالعہ نہ کرنے کے سبب ان کے تحقیقی محاسن سے بے خبر ہے۔ بہرکیف اصحابِ کہف کے تعلق سے روایات میں جو سرگزشت بیان ہوئی ہے وہ چیستاں کے سوا کچھ نہیں۔ اصحاب کہف کے کوائف کی تفتیش کے ساتھ ان کے کتّے کی تعریف وتوصیف میں خاصا وقت صرف کیا گیا ہے۔ مثلاً کتّے کا نام کیا تھا؟ اس کا رنگ کیسا تھا؟ زرد تھا یا سرخ؟ اسی طرح ایک روایت میں ہے کہ یہ واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے کا ہے۔اس میں یہ بھی ہے کہ کوفہ کے عبید نامی شخص نے اصحاب کہف کے کتّے کو دیکھا تھا۔مولانا ادروی نے اس ضمن میں عہد حاضر کے مفسرین کے اقوال بھی نقل کیے ہیں۔ ایک روایت میں یہ بھی مذکور ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے اللہ سے دعا کی تھی کہ مجھے اصحاب کہف کو دکھایا جائے۔اس کی تفصیل یوں ہے:

> ''اس روایت میں منجملہ اور محیر العقول باتوں کے یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائی کہ مجھے اصحاب کہف کو دکھا دیجیے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہا گیا کہ آپ ان کو اس دنیا میں نہیں دیکھ سکتے، البتہ آپ اپنے اصحاب میں سے چار معزز صحابہ کرامؓ کو ان کے پاس بھیج دیجیے، تاکہ وہ آپ کا پیغام رسالت ان لوگوں تک پہنچادیں اور ان کو ایمان کی دعوت دیں۔ رسول اللہ ﷺ نے جبرئیل علیہ السلام سے فرمایا کہ میں کس طرح ان لوگوں کو ان کے پاس بھیجوں؟

جبرئیل نے کہا: آپ اپنا کمبل بچھا دیجیے، اس کے ایک کونے پر ابوبکر صدیقؓ، دوسرے کونے پر عمر فاروقؓ، تیسرے کونے پر عثمان غنیؓ اور چوتھے کونے پر علی ابن ابی طالبؓ بیٹھ جائیں اور پھر آپ اس ہوا کو بلوائیے جو حضرت سلیمان کے لیے مسخر کی گئی تھی۔ اللہ نے ہوا کو حکم دے رکھا ہے کہ وہ آپ کی اطاعت کرے۔ آپؐ نے ایسا ہی کیا۔ ہوا ان چاروں کو اُڑا کر کہف کے دروازے تک لے گئی، پھر ان لوگوں نے کہف کے دروازے کے پتھر کو اکھیڑا تو اصحاب کہف کے کتّے نے ان لوگوں پر حملہ کر دیا، لیکن جب ان لوگوں کی صورتیں دیکھیں تو دُم ہلانے لگا اور سر کے اشارے سے کہا: اندر چلے جائیے، سب لوگوں نے کہف میں داخل ہو کر السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہا: اس وقت اللہ تعالیٰ نے نوجوانانِ کہف کی روحوں کو ان کے جسموں میں لوٹا دیا تھا۔ وہ سب اٹھ کھڑے اور جواب میں کہا: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ ان چاروں بزرگوں نے اصحاب کہف سے کہا: محمد رسول اللہؐ آپ کو سلام کہتے ہیں'' ۱۴

روایتوں میں 'رقیم' کے حوالے سے بہت کچھ کہا گیا ہے۔ ایک قول کے مطابق اس سے مراد ایک گاؤں ہے، یا فلسطین میں ایلہ کے قریب ایک وادی ہے، یا اس پہاڑ کا نام ہے جس کے غار میں اصحاب کہف نے قیام کیا تھا۔ رقیم مرقوم کے مفہوم ہے،، یعنی وہ کتاب، تختی یا پتھر یا سیسہ کی چادر، جس پر اصحاب کہف کی داستان تحریر کی گئی۔ اس تعلق سے مولانا ادروی نے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ، مفتی محمد شفیعؒ اور مولانا ابوالکلام آزادؒ کی آراء بھی نقل کی ہیں۔ مولانا آزاد کے نزدیک ایلہ کے قریب شہر 'بطراء' مراد ہے، جسے رقیم کہا جاتا رہا ہے۔ اس میں مسجد کے آثار بھی موجود ہیں۔ مولانا نے بائبل سے استدلال کیا ہے۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اپنی تصنیف 'ارض القرآن' میں مولانا آزاد کی رائے سے اتفاق کیا ہے۔ ۱۵ مولانا حفیظ الرحمٰن سیوہارویؒ نے 'قصص القرآن' میں اسی کو اختیار کیا ہے۔ ۱۶ توریت، سفر عدد اور صحیفہ سلیار سے استدلال کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ اس سے شہر پٹرا مراد ہے۔ مولانا ادروی نے اصحابِ کہف کے بارے میں

مروی روایات پر یوں تبصرہ کیا ہے:

''ان روایتوں میں زیادہ حصہ انہی اخبار کا ہے جو اہل کتاب نے بیان کے ہیں۔ انھوں نے اسلام لانے کے بعد ان واقعات کو مجلسوں میں بیان کیا، واقعہ کی تعجب خیزی اور حیرت ناکی کی وجہ سے صحابۂ کرام اور تابعین کی یادداشتوں میں یہ واقعات محفوظ رہ گئے اور انھوں نے کہیں کہیں اسے بہ طور قصہ اور حکایت بیان کر دیا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ حضرات ان کی صداقت پر یقین رکھتے تھے، بلکہ اس کی تصدیق وتکذیب سے الگ ہوکر، جو دوسروں سے سنا تھا، اس کا ذکر کر دیا۔ حافظ ابن کثیرؒ کی یہی رائے ہے۔ اپنی تفسیر میں انھوں نے اس سلسلے کی بیش تر روایتوں کے بارے میں بحث کر کے بتایا ہے کہ وہ صحیح نہیں ہیں اور یہ روایتیں اہل کتاب سے لی گئی ہیں۔'' [۱]

## واقعہ نکاح زیدؓ و زینبؓ

قرآن مجید میں حضرت زیدؓ سے حضرت زینبؓ کے نکاح، پھر ان سے طلاق کے بعد رسول اللہ ﷺ سے نکاح کا واقعہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

وَإِذْ تَقُولُ لِلَّذِیْ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللَّهَ وَتُخْفِیْ فِیْ نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيْهِ وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللَّهُ أَحَقُّ أَن تَخْشَاهُ فَلَمَّا قَضَى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَراً زَوَّجْنَاكَهَا لِكَیْ لَا يَكُونَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِیْ أَزْوَاجِ أَدْعِيَائِهِمْ إِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَراً وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ مَفْعُولاً۔ (الاحزاب:۳۷)

(اور یاد کرو جب کہ تو اس شخص سے کہہ رہا تھا جس پر اللہ نے انعام کیا اور تو نے بھی کہ تو اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھ اور اللہ سے ڈر اور تو اپنے دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھا جسے اللہ ظاہر کرنے والا تھا، اور لوگوں سے خوف کھاتا تھا، حالاں کہ اللہ تعالیٰ اس کا زیادہ حق دار تھا کہ تو اس سے ڈرے، پس جب کہ زید نے اس عورت سے اپنی غرض پوری کر لی تو ہم نے اسے تیرے نکاح میں دے دیا کہ مسلمانوں پر اپنے

لے پالکوں کی بیویوں کے بارے میں کسی طرح کی تنگی نہ رہے، جب کہ وہ اپنی غرض ان سے پوری کرلیں۔ اللہ کا حکم تو ہوکر ہی رہنے والا تھا۔)

اس واقعہ کا پس منظر یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے منھ بولے بیٹے زید بن حارثہؓ کا نکاح حضرت زینب بن جحش سے کروایا۔ زیدؓ پہلے غلام تھے۔ حضرت زینب، جوامیہ بنت عبدالمطلب کی بیٹی تھیں، رشتے کے اعتبار سے آپؐ کی پھوپھی زاد بہن تھیں۔ اکثر دونوں میں تکرار رہتی، کیوں کہ زید بن حارثہؓ سماجی اعتبار سے کم حیثیت کے مالک تھے اور حضرت زینبؓ کا تعلق ایک باوقار خاندان سے تھا۔ اللہ کے رسول ﷺ سے زید ان دشواریوں کو بیان کرتے، لیکن آپؐ ہر بار نباہنے کا حکم صادر کرتے۔ ایک وقت ایسا آیا کہ یہ نکاح ٹوٹ گیا اور اللہ کی طرف سے حکم ہوا کہ آپ انھیں اپنے نکاح میں لے لیں۔ چنانچہ آپؐ نے حکم ربانی پر عمل کیا، لیکن افسوس کہ خاتم النبیین کے حاسدین اور اعداء نے اسے ایک خاص رنگ دے دیا۔ اسرائیلی روایات کے ذریعہ آپؐ کی معصومیت، تقدس، عظمتِ نبوت اور ناموسِ رسالت کو داغ دار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان روایات کو پڑھتے ہوئے انسان کانپ اٹھتا ہے کہ دنیا کے سب سے حیادار اور بلندترین کردار کے حامل کے ساتھ یہ کیسا رویہ اختیار کیا گیا ہے؟! اسے پڑھ کر انسانیت سرنگوں ہوجاتی ہے اور حیا انگشت بدنداں۔ دل پر جبر کرکے یہ واقعہ یہاں نقل کیا جارہا ہے، تاکہ گم راہ کن اسرائیلیات کا مشاہدہ کیا جاسکے:

> ''ایک روایت قتادہ اور عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم سے ہے۔ اس میں کہا گیا کہ ایک دن حضور اکرم ﷺ زید کے گھر اس وقت گئے جب زید گھر پر نہیں تھے۔ حضرت زینب کو بنی سنوری دیکھا، ایک دوسری روایت میں ہے کہ ہوا نے زید کے دروازے کے پردے کھول دیے تو زینب کے حسن و جمال کو دیکھا۔ ان کی محبت آپ کے دل میں گھر کر رہ گئی۔ آپ سبحان اللہ العظیم، سبحان مقلّب القلوب کہتے ہوئے لوٹ آئے۔ جب باہر سے زید آئے تو زینب نے واقعہ بیان کیا کہ حضور تشریف لائے تھے اور یہ کہتے ہوئے واپس

تشریف لے گئے۔ بیوی سے یہ سن کر زید حضورؐ کے پاس گئے اور کہا: مجھے معلوم ہوا کہ حضور گھر تشریف لے گئے تھے، لیکن گھر میں داخل نہیں ہوئے۔ اگر زینب آپ کو پسند آ گئی ہو تو میں طلاق دے دوں''۔ ۱۸؎

مولانا نے اس روایت کے لایعنی ہونے پر اس طرح تبصرہ کیا ہے:

''مذکورہ روایت کا ایک راوی عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم ہے۔ اس کو علماء جرح وتعدیل نے متہم بالکذب کہا ہے اور اس پر عجائب وغرائب والی روایتوں کو بیان کرنے کا بھی اتہام ہے۔ تاریخ نویسوں اور ان تفسیر کرنے والوں نے لکھا ہے جو ہر رطب ویابس روایت کو بلا جھجک نقل کر دیتے ہیں اور کثرتِ روایات کا شوق رکھتے ہیں۔ یہ روایت یا اس طرح کی کوئی اور روایت احادیثِ صحیحہ کے کسی ایسے مجموعہ میں نہیں ہے جس پر اعتماد کیا جائے اور جو کچھ صحیح حدیثوں میں آیا ہے وہ اس کے مخالف ہے اور اس واقعہ کی تردید ہوتی ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت انس بن مالکؓ سے جو روایت ہے اس میں آیت ''تُخْفِیْ فِیْ نَفْسِکَ'' (الاحزاب: ۳۳/ ۳۷) (اور تو اپنے دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھا) کے بارے میں کہا گیا ہے کہ زینب بنت جحشؓ اور زید بن حارثہؓ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ بس اتنی ہی بات پر اکتفا کیا گیا ہے اور مذکورہ بالا روایت کی تفصیلات کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے قتادہ کی اس روایت کو ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اس سلسلہ میں دوسرے آثار بھی وارد ہیں، جنھیں ابن ابی حاتم اور طبری نے لیا ہے اور دوسرے مفسرین نے بھی نقل کیا ہے، لیکن وہ تمام روایتیں اس لائق نہیں ہیں کہ ان کا ذکر بھی زبان پر لایا جائے''۔ ۱۹؎

## ذبیح کون؟

مولانا نے اس کتاب میں یہ مسئلہ بھی اٹھایا ہے کہ 'ذبیح کون ہے؟' سوادِ امت کا خیال ہے کہ ذبیح حضرت اسحاقؑ نہیں، بلکہ حضرت اسماعیلؑ ہیں، جن کا ذکر سورۂ

صافات (آیات:۱۰۱-۱۰۲) میں اس طرح آیا ہوا ہے: فَبَشَّرْنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ .فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يَا بُنَيَّ إِنِّيْ أَرَى فِيْ الْمَنَامِ أَنِّيْ أَذْبَحُكَ۔

اس آیت کریمہ پر نظم قرآن کی رعایت کے ساتھ غور کیا جائے تو اس اعتراف میں کوئی تامل نہیں کہ ذبیح حضرت اسماعیلؑ ہیں، لیکن یہود نے اس حقیقت کو چھپانے کی کوشش کی ہے، تاکہ یہ وقار اللہ کے رسول ﷺ سے منسوب نہ ہو۔ چوں کہ رسول اللہ ﷺ کا سلسلۂ نسب حضرت اسماعیلؑ سے ملتا ہے اس لیے ان کی یہ کوشش رہی کہ اس انتساب کو کہیں اور پھیر دیں۔ مولانا ادروی نے قرآن کریم اور توریت نیز احادیث سے ثابت کیا ہے کہ ذبیح حضرت اسماعیلؑ ہیں۔ انہوں نے ان روایات کو بھی نقل کیا ہے جن میں ذبیح حضرت اسحٰقؑ کو بتایا گیا ہے۔ مولانا نے بغوی، سیوطی کے حوالے سے آنے والی روایات کو نقل کر کے ان کے نقائص اور ضعف کو بیان کیا ہے۔ ان کا یہ تبصرہ قابل قدر ہے:

> ''مذکورہ بالا چاروں روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ذبیح حضرت اسماعیلؑ کے بجائے حضرت اسحاقؑ ہیں۔ لیکن ان روایتوں میں کوئی روایت لائق احتجاج نہیں۔ اب سلسلہ وار ہر روایت پر ایک نظر ڈال لی جائے۔ پہلی روایت جو عباس بن عبدالمطلبؓ سے ہے، وہ ضعیف اور ساقط ہے، جس سے احتجاج صحیح نہیں ہے۔ روایت کے ایک راوی حسن بن دینار کو متروک کہا گیا ہے اور اس کے شیخ علی بن زید بن جدعان کو علماء جرح وتعدیل نے منکر الحدیث لکھا ہے، اس لیے یہ روایت قابل حجت نہیں ہے۔ دوسری روایت مسند الفردوس کی ہے۔ تیسری روایت مسند الفردوس اور دار قطنی کی ہے۔ یہ دونوں روایتیں صحیح نہیں ہیں اور نہ ثابت ہیں۔ دیلمی کی مسند الفردوس کی روایتوں کا وزن محدثین کے نزدیک جتنا ہے اہل علم سے پوشیدہ نہیں۔ دار قطنی تو بعض اوقات موضوع روایتوں تک لکھ جاتے ہیں۔ چوتھی روایت، جو ابو ہریرہؓ سے ہے، اس کا ایک راوی عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم ضعیف ہے۔ یہ

منکرات کی روایت کرتا ہے اور اس کی روایتیں حجت نہیں ہوتیں۔ حافظ ابن کثیرؒ نے اس کو غریب حدیث کہا ہے اور منکر بھی۔ یہ بھی لکھا ہے کہ ہوسکتا، روایت کا کچھ حصہ صحیح ہو اور بعد کا حصہ اس میں جوڑ دیا گیا ہو، جس ٹکڑے میں حضرت اسحاقؑ کے ذبیح ہونے کا ذکر ہے، اگر یہ جملہ درج نہیں ہے تو اس جگہ اسماعیلؑ رہا ہوگا اور راوی نے تحریف کر کے اسحاقؑ کا نام لے لیا ہو۔'' ۲۰

توریت میں تمام تر تبدیلیوں کے باوجود یہ قوی تاثر ابھرتا ہے کہ حضرت اسماعیلؑ دراصل حضرت ابراہیمؑ کے اکلوتے بیٹے تھے اور اکلوتے ہی کی قربانی کا الہامی حکم صادر ہوا تھا، لیکن توریت میں جہاں اکلوتے بیٹے کا ذکر ہے وہاں اس کے آگے حضرت اسحٰقؑ کا نام لکھ دیا گیا تھا۔ یہ سب تحریفات اس لیے کی گئیں کہ یہود کو عربوں سے ازلی بغض تھا۔ وہ کسی طرح کا اعزاز انھیں دینے کو تیار نہ تھے۔ مولانا ادروی نے یہ بھی صراحت کی ہے کہ کسی صحیح روایت میں حضرت اسحاقؑ کے ذبیح ہونے کا ذکر نہیں ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مولانا نے علامہ نسفی کا حوالہ دیتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ ذبیح حضرت اسماعیلؑ ہیں۔ اسی طرح علامہ سیوطیؒ نے اپنے رسالہ 'القول الصحیح فی تعیین الذبیح' میں مختلف صحابہ کرام، تابعین عظام اور قابل ذکر شخصیات کا حوالہ دیتے ہوئے یہ صراحت کی ہے کہ حضرت اسماعیلؑ ہی ذبیح ہیں۔ مولانا نے استدلال کے لیے علامہ ابن تیمیہؒ کا بھی حوالہ دیا ہے۔ علامہ کی اس رائے کو ان کے شاگرد رشید علامہ ابن قیمؒ نے نقل کیا ہے۔ اس میں ایک دلیل یہ ہے:

''اس میں انھوں نے بتایا ہے کہ سورۃ الصافات میں ہے: وَبَشَّرْنَاهُ بِإِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ (الصّٰفّٰت: ۱۱۲) ''اور ہم نے اسے اسحٰق نبی کی بشارت دی، جو صالح لوگوں میں سے ہوگا۔'' اس آیت سے پہلے حضرت ابراہیمؑ کے خواب، بیٹے سے اس کا ذکر، میدان میں ذبح کے واقعہ کو پورے طور پر بیان کرنے کے بعد یہ آیت آئی ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی شخص کے متعلق اس کی زندگی کے کسی خاص واقعہ کو بیان کیا جا رہا

ہے تو اس کے سارے کارنامے کے بعد اس کی پیدائش کی خوش خبری دینے کا کوئی معنٰی نہیں۔ یہ فصاحتِ کلام کے قطعاً منافی ہے۔ اس لیے آیت ماسبق میں جس ذات کا واقعہ بیان کیا گیا ہے وہ اس ذات کے علاوہ ہے جس کی اب خوش خبری دی جارہی ہے اور وہ حضرت اسماعیلؑ کی ذاتِ گرامی ہے۔ یہ آیت مسئلہ میں نص ہے۔ اس لیے حضرت اسماعیلؑ کا ذبیح ہونا متعین ہے''۔ ۲۱

مولانا اسیر ادروی نے قرآن کریم، توریت اور روایات کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ ذبیح حضرت اسماعیلؑ ہیں۔ اسی طرح انہوں نے ان مستند مراجع کا بھی ذکر کیا ہے جن سے حقیقی طور سے حضرت اسماعیلؑ کا ذبیح ہونا معلوم ہوتا ہے، لیکن افسوس کہ انہوں نے اپنے ہم وطن مولانا حمیدالدین فراہیؒ کی یگانۂ روزگار تصنیف 'الرأی الصحیح فیمن ھو الذبیح' سے استفادہ نہیں کیا ہے۔ اگر مولانا کے پیش نظر یہ کتاب ہوتی تو یہ بحث مزید معتبر بن جاتی۔ شاید یہ دعویٰ درست ہو کہ ذبیح کے تعلق سے اس قدر مدلل نقطۂ نظر متقدمین کے یہاں نہیں ملتا۔ مولانا فراہی نے دلائل کی روشنی میں ان لوگوں کی تردید کی ہے جن کے نزدیک ذبیح حضرت اسحٰقؑ ہیں۔ حضرت اسماعیلؑ کو ذبیح قرار دینے کے لیے مولانا فراہی نے دس دلائل کتبِ مقدسہ سے، دس دلائل قرآن کریم سے اور دس دلائل روایات سے پیش کیے ہیں۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ مولانا نے اپنی تحقیق کی بنیاد ان مصادر ومراجع پر نہیں رکھی ہے جن میں حضرت اسماعیلؑ کو ذبیح قرار دیا گیا ہے۔ وہ چوں کہ عبرانی زبان سے واقف تھے اور توریت اور یہود کی تاریخ سے براہ راست استفادہ کیا کرتے تھے۔ اس لیے انہوں نے اس بحث میں بھی یہودی مراجع سے استفادہ کیا ہے۔

## حضرت ایوبؑ کا مرض

اس کتاب میں حضرت ایوبؑ کا بھی ذکر ہے۔ آغاز میں سورۂ ص کی وہ آیات نقل کی گئی ہیں جن میں ان کی ابتلا کا ذکر ہے۔ یہ تو اندازہ لگانا مشکل ہے کہ سببِ ابتلا کیا

تھا؟ لیکن اتنا ضرور مترشح ہوتا ہے کہ ان کو سخت ترین امتحان میں ڈال دیا گیا تھا، جس پر انہوں نے مثالی صبر کا ثبوت دیا تھا، لیکن اسرائیلیات نے اس میں خوب رنگ آمیزی کی ہے اور اس امتحان کو ایک افسانہ میں بدل دیا ہے۔ قتادہؒ کی روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ جب حضرت ایوبؑ اس ابتلا سے دوچار ہوئے تو ان کے آل اولاد، مال اور مویشی سب کچھ ہلاک و برباد ہوگئے اور ان کے جسم کو شدید زخم لاحق ہوئے۔ وہ اس مصیبت میں سات سال اور کچھ مہینے مبتلا رہے اور بنی اسرائیل کے کوڑے خانہ میں پڑے رہے۔ ان کے زخموں میں کیڑے رینگتے رہے۔ پھر اللہ نے ان کی مصیبت کو دؤر کر دیا اور ان کو بہترین اجر دیا۔ ۲۲

اس ضمن میں مولانا نے بہت سی روایات اور ائمہ کے اقوال نقل کیے ہیں۔ ابن عربیؒ کا خیال ہے کہ اس واقعے کے تعلق سے صرف قرآن کریم پر انحصار کیا جائے۔ اس باب میں اللہ کے رسول ﷺ سے ایک حرف بھی ثابت نہیں ہے، سوائے اس ٹکرے کے بَیْنَمَا اَیُّوب یَغْتَسِلُ خَرَّ رِجْلٌ مِنْ جَرَادِ ذَهَبٍ۔ جب قرآن اور حدیث نے ہمیں واقعہ کی تفصیل نہیں بتائی ہے تو وہ تیسرا کون ہے جو حضرت ایوب کا واقعہ ہمیں سنا رہا ہے۔ یہ بتایا جائے کہ یہ تفصیلات کہاں سے آئی ہے؟ وہ کون سا مستند ذریعہ ہے جس کے بیان کردہ واقعہ کو بلا تحقیق قبول کر لیا جائے؟ علماء امت کے نزدیک اسرائیلیات متروک ہیں، اس لیے ادھر سے آنکھیں پھیر لو اور ان خرافات سے اپنے کانوں کو بند کر لو، کیوں کہ وہ بے بنیاد افسانے اور کہانیاں گڑھتے ہیں۔ حضور ﷺ نے اسرائیلی روایات کے سلسلے میں جو کچھ فرمایا ہے اس کو ضرور سن لو۔'' (ص:۳۲۵) مولانا نے مؤطا کے حوالے سے بتایا ہے کہ یہ تمام تفصیلات افسانہ ہیں اور اسے قرآن سے جوڑنا جرأت بے جا ہے۔ اس کا تفسیر قرآن سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

## 'ق' سے مراد

'ق والقرآن المجید' کے حوالے سے کتبِ تفسیر فاسد اسرائیلیات سے مملو ہیں۔ حرفِ مقطع 'ق' کے حوالے سے ایک لایعنی دفتر ہے، جہاں توہمات و خرافات کی ایک

دنیا آباد ہے۔اسی سلسلے کی ایک روایت درج ذیل ہے:

''اللہ تعالیٰ نے اس زمین کے بعد سمندر کو پیدا کیا ہے، جو ساری زمین کو گھیرے ہوئے ہے۔ اس سمندر کے بعد اس نے ایک پہاڑ پیدا کیا ہے، جس کو قاف کہا جاتا ہے۔ یہ پہاڑ سمندر کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ آسمان کی چھت اسی پہاڑ پر رکھی ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس قاف پہاڑ کے بعد پھر ایک زمین پیدا کی ہے۔ اس کے بعد سمندر، اس کے بعد پہاڑ، اسی طرح سات زمین سات سمندر اور سات پہاڑوں کو پیدا کیا ہے''۔ ۲۳

ایک دوسری روایت اس طرح ہے:

''اللہ نے ایک پہاڑ پیدا کیا ہے، جس کا نام قاف ہے۔ وہ سارے عالم کو گھیرے ہوئے ہے۔ اس پہاڑ کی جڑیں اس چٹان تک پہنچتی ہے جس پر یہ زمین قائم ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ جب کسی آبادی میں زلزلہ پیدا کرنا چاہتا ہے تو اس پہاڑ کو حکم دیتا ہے۔ وہ پہاڑ اپنی اس جڑ کو حرکت دیتا ہے جو اس آبادی کی زمین سے ملی ہوئی ہے۔ پس اس آبادی میں زلزلہ آجاتا ہے اور بقیہ ساری آبادیاں محفوظ رہتی ہیں۔'' ۲۴

مولانا ادروی نے ان خیالات کو بے بنیاد بتایا ہے اور کہا ہے کہ ان کا صداقت سے کوئی ناطہ نہیں، قرآن کریم اور احادیثِ صحیحہ سے اس کی ذرہ برابر بھی تائید نہیں ہوتی۔ معاصر سائنس کی روشنی میں اس کوہِ قاف کا آتا پتا نہیں ہے۔ مولانا نے بجا طور پر تحریر کیا ہے:

''اس کوہ قاف کا حقیقی وجود نہیں۔ آج حضرت انسان نے بحر و بر کا چپہ چپہ چھان مارا ہے اور مدار سرطان بار بار ہو آیا ہے، لیکن اس نے پہاڑ کو کہیں نہیں دیکھا۔ اس لیے یہ طعنہ تو برداشت کیا جاسکتا ہے کہ صحت کا التزام رکھنے والے محدثین نے اس روایت کو صحیح مانا ہے اور ہم اس کی صحت سے انکار کر رہے ہیں، لیکن یہ ہمارے لیے اس سے کہیں آسان ہے کہ یہ لوگ یہ کہیں کہ جو چیز تجربہ اور مشاہدہ کے خلاف ہے اس کے وجود پر یہ لوگ اندھا یقین رکھتے ہیں''۔ ۲۵

## 'ن' کا مفہوم

سورۂ نون کا آغاز 'نٓ وَالقَلَمِ وَمَا یَسطُرُونَ' سے ہوا ہے۔'ن' حروف مقطعات میں سے ہے۔ اس موضوع سے متعلق اسرائیلیات میں لاطائل مباحث ہیں۔ روایات لایعنی مواد سے پُر ہیں، جن کا کوئی تعلق اس حرف سے نہیں ہے۔ اس باب میں حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت ہے: ''اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا اور اس نے وہ سب کچھ لکھ دیا جو واقع ہونے والا ہے۔ پھر پانی سے بھاپ بلند ہوئی۔ انہی بخارات سے آسمان بنائے گئے، پھر نون مچھلی پیدا کی گئی اور اس کی پشت پر یہ زمین بچھادی گئی۔ زمین کے بوجھ سے مچھلی کلبلائی اور زمین ڈگمگانے لگی تو زمین پر بڑے بڑے پہاڑوں کو گاڑ دیا گیا، جس کی وجہ سے زمین کا ڈگمگانا بند ہوگیا۔'' حضرت ابن عباسؓ کی ایک اور روایت میں ہے: ''نون دوات کے معنیٰ میں ہے، جو قلم کے ذکر کے ساتھ مناسب ہے۔ زمخشری نے اس معنیٰ کو تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اہل لغت میں سے کسی نے 'نون' کے معنیٰ دوات کے نہیں لکھے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت ہے کہ الرحمٰن کے لفظ کا آخری حرف نون ہے، جس نے الرحمٰن کو جدا جدا کردیا ہے۔''[۲۶]

مفسرین کے نزدیک نون ایک مچھلی ہے، جس پر زمین قائم ہے۔ اس کا نام 'بہموت' ہے، روایت میں اس کا ایک مفہوم دوات ہے۔ اس طرح کی تمام روایات موضوع ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ اس سے زمین کی ایک چٹان مراد ہے، جو بیل کی سینگ پر ہے۔ جب بیل اپنی سینگ کو ہلاتا ہے تو زمین ہلنے لگتی ہے۔ یہ سب روایات اہل کتاب کی ساختہ و پرداختہ ہیں، جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ ابن قیمؒ کے نزدیک یہ تمام روایات اختراع کردہ ہیں۔

یہاں یہ صراحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ مولانا حمیدالدین فراہیؒ نے حروفِ مقطعات پر قابلِ قدر گفتگو کی ہے۔ ان کے نزدیک عربی حروف عبرانی زبان سے ماخوذ ہیں۔ یہ حروف مخصوص صورتوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے وضع کیے گئے ہیں۔ انہوں نے

عبرانی حروف کی ان جہتوں پر عالمانہ گفتگو کی ہے۔ مثلاً الف کی صورت کچھ ایسی ہے جو گائے کی شکل سے ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۂ بقرہ میں گائے کا ذکر ہے۔ قرآن کریم کی وہ سورتیں جن کا آغاز حرف 'ط' سے ہوتا ہے ان میں سانپ کا ذکر ہے، کیوں کہ عبرانی زبان میں 'ط' کا مفہوم سانپ ہے۔ اسی طرح حرف 'ن' کا مفہوم مچھلی ہے، چنانچہ سورۂ نون میں حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر ہے، جنھیں مچھلی نے نگل لیا تھا۔ اسی طرح سے دیگر حروف کے متعلق غور کیا جاسکتا ہے۔ حروفِ مقطعات کے باب میں مولانا فراہیؒ کا نقطۂ نظر مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے تدبر قرآن کی پہلی جلد میں بیان کردیا ہے۔[۲۷] مولانا اسیر ادروی نے حرف 'ق' اور حرف 'ن' کے متعلق جن تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ ان سے یہی پتا لگتا ہے کہ ان حروف کے متعلق غور کرنا مناسب نہیں ہے، کیوں کہ یہ ایسے اسرار ہیں جن کے حقائق اللہ کے پاس ہیں۔ انھیں متشابہات میں شمار کیا گیا ہے۔

## جنتِ شدّاد

کتبِ تفسیر اور اردو کے افسانوں میں جنتِ شداد کا تفصیلی ذکر ہے۔ مفسرین نے آیت أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ إِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ (الفجر:۶-۷) ''کیا آپ نے نہیں دیکھا، آپ کے رب نے عاد کے ساتھ کیا کیا۔ ستونوں والے ارم کے ساتھ'' کی روشنی میں قوم عاد کی خلقتِ عجیبہ کا تذکرہ کیا ہے۔

قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ قومِ عاد اپنی طاقت وقوت، شان وشوکت اور قد کے اعتبار سے مثالی تھی۔ شمالی حضرموت کی گھاٹیاں ان کا مسکن تھیں۔ ذات العماد سے ان کی جسمانی کیفیت اور ان کے پُرشکوہ محلات اور قلعوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ بڑے قدآور قوی الجثہ تھے۔ عاد کے دولڑکے تھے: شدّاد اور شدید۔ دونوں نے اپنی عسکری قوت سے ایک بڑے علاقے کو فتح کرلیا تھا۔ آگے چل کر جب شدید کا انتقال ہوگیا تو شدّاد اس پوری لق ودق ریاست کا تنہا مالک ہوگیا۔ اس نے اہل کتاب سے جنت کی خوش نمائیوں، تنعم وتعیش، باغات، نہروں، محلات اور مشروبات کا ذکر سن رکھا تھا۔ اس نے تہیہ کیا کہ اسی

طرز پر ایک ارضی جنت کی تعمیر کروائے گا۔ چنانچہ اس نے ایسا کر بھی لیا۔ جب جنت تیار ہوگئی تو اسے دیکھنے کے لیے روانہ ہوا،لیکن اس کی زیارت سے قبل عذابِ الٰہی نے اسے ابدی نیند سلا دیا۔قرآن کریم کی مذکورہ آیت سے صرف اتنا پتا چلتا ہے کہ قوم عاد ایک طاقت ور قوم تھی، یہ لوگ پہاڑوں کو تراش کر خوب صورت محل کھڑا کر دیتے تھے۔اسے فن تعمیر میں خصوصی مہارت حاصل تھی،لیکن اللہ کی نافرمانی اور سرکشی کی وجہ سے مستحق عذاب ہوئے۔سرسید نے مفسرین اور اسرائیلیات دونوں کے لاطائل مباحث پر تنقید کی ہے۔۲۸

جنت شداد ایک افسانوی بیانیہ ہے، جس کو اسرائیلیات نے خاص رنگ دیا ہے اور مفسرین نے اسے اپنی تفاسیر میں جگہ دی ہے ۔مولانا ادروی نے لکھا ہے کہ روایتوں میں اس کی درج ذیل تفصیل ملتی ہے:

> ''شدّاد نے عدن کے صحرائی علاقہ میں جنت ارم بنائی، جس کو جنت شداد کہا جاتا ہے۔ اس جنت کو بنانے میں اسے تین سو سال کی مدت لگی۔اس نے عمر بھی لمبی پائی تھی۔ وہ نوسو سال تک اس دنیا میں رہا۔ارم ایک بہت بڑا شہر ہے ۔اس کی شہر پناہ سونے اور چاندی کے اینٹوں سے بنائی گئی تھی۔ اس کی عمارتوں میں لگائے جانے والے ستون زبرجد اور یاقوت کے تھے۔ اس کے سنگ ریزے اور بجریاں ہیرے، جواہرات اور موتیوں کی تھیں۔جب یہ جنت ارضی بن کر تیار ہوگئی تو اس کی بڑی تیاریوں اور لاؤلشکر کے ساتھ جنت کے معائنہ کا ارادہ کر کے اپنے تمام خدم وحشم کو لے کر چل پڑا اور جب اس جنت ارضی سے ۲۴ رگھنٹہ کی مسافت کی دوری پر تھا کہ ایک چیخ سنائی دی۔ یہ چیخ اتنی کرخت تھی کہ شداد وہیں مر گیا اور اپنی بنائی ہوئی جنت میں قدم نہ رکھ سکا۔'' ۲۹

حافظ ابن کثیرؒ نے ان یاوہ گوئیوں پر یوں تبصرہ کیا ہے:

> ''جو شخص یہ کہے کہ 'ارم ذات العماد' ایک شہر ہے، یا یہ دمشق کا نام ہے، یا اسکندریہ کو کہتے ہیں تو ان میں سے کوئی بات بھی قابل تسلیم نہیں۔ کیوں کہ آیت قرآنی کا سیاق وسباق اور انداز بیان اس کی تردید

کرتا ہے۔ جولوگ ارم کو شہر کہتے ہیں، جس کی چہار دیواری سونے اور چاندی کے اینٹوں کی تھی اور اس کے سنگ ریزے اور بجری موتیوں اور جواہرات کی تھی، اس کی مٹی مشک کی تھی وغیرہ، یہ ساری تفصیل بنی اسرائیل کی خرافات ہیں۔ ان کے بددینوں اور زندیقوں کی گھڑی ہوئی ہیں۔ ابن قلابہ کا قصہ بھی غیر مستند ہے۔ اگر بالفرض اس کی سند صحیح بھی ہو تو یہ اس بدوی کی خود گھڑی ہوئی کہانی ہے اور کسی طرح کی ہوس نے اس کو اس جھوٹی کہانی گھڑنے پر مجبور کیا ہے۔ اس نے جاہل اور توہم پرست عوام کی طرح یقین کرلیا کہ یہاں ہیرے جواہرات دفن ہیں، جن کا خارج میں کوئی وجود نہیں ہے''۔۳۰

ابن خلدون نے جنّت شداد کو ایک واہمہ قرار دیا ہے۔آلوسی نے بھی ان روایات کا ذکر کیا ہے جو کذب وافتراء پر مبنی ہیں۔ ایک روایت میں یہاں تک ہے کہ قوم عاد کے لوگ چٹانوں کو کاندھوں پر اٹھا کر لاتے اور جس قبیلے پر چاہتے انھیں پھینک کر تباہ وبرباد کردیتے تھے۔ یہ ایک مضحکہ خیز اور افسانوی تخلیق ہے جس کا قرآنی مزاج سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

## قصۂ عصائے موسیٰ

قرآن کریم میں قصۂ موسیٰ وفرعون کا بار بار ذکر ہوا ہے۔ اس کا تذکیری پہلو صرف یہ ہے کہ اللہ کی عزت وعظمت کے سامنے تمام دنیاوی جاہ واقتدار ہیچ ہے۔ فرعون خود کو رب اعلیٰ گردانتا تھا۔ اپنے اقتدار کے بالمقابل وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ اللہ نے اس کا غرور خاک میں ملادیا۔ یہ کام اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کے عصا سے لیا۔ عصا کی ایک خاص کیفیت کا ذکر قرآن میں آیا ہوا ہے۔ اس کیفیت کو اسرائیلی روایات میں اس طرح بیان کیا گیا ہے اور ایسی ملمع سازی کی گئی ہے کہ اسے پڑھ کر عقل انسانی حیرت زدہ ہوجاتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک روایت ملاحظہ ہو:

''وہب بن منبہ کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے

جب عصا زمین پر ڈالا تو دیکھا کہ وہ ایک عظیم الجثہ اژدہا بن گیا۔ لوگ حیرت واستعجاب اور خوف زدہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اژدہا اِدھر اُدھر رینگ رہا ہے، جیسے کچھ تلاش کر رہا ہو۔ وہ رینگتا ہوا پہاڑ کی چٹانوں کے پاس پہنچ گیا تو بھوکے اونٹ کی طرح بیتابی کے ساتھ پوری چٹان نگل گیا۔ جب وہ اپنا منھ بڑے سے بڑے تناور درخت کی جڑوں پر لگا دیتا تھا تو اس کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیتا تھا۔ اس کی دونوں آنکھیں دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح تھیں۔ اس کے بال نیزوں کی طرح تھے۔ اس کا منھ ایک چوڑے کنویں کی طرح تھا، جس میں بڑے بڑے نوک دار اوپر تلے دانتوں کی قطار تھی۔ جب یہ دانت ایک دوسرے سے ٹکراتے تھے تو ایک کرخت آواز پیدا ہوتی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب اژدہا کی ہیئت کذائی دیکھی تو مارے خوف کے پیٹھ پھیر کر بھاگے اور مُڑ کر نہیں دیکھا۔ اژدہا اپنی جگہ پر رہا، اس نے پیچھا نہیں کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کچھ دور جا کر رکے اور دیکھا کہ اژدھا جادوگروں کے سانپوں کو ایک ایک کر کے نگل گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو اپنی بات یاد دلائی تو وہ مارے شرم کے کھڑے ہو گئے۔ ان سے کہا گیا کہ تم جہاں تھے وہیں لوٹ جاؤ۔ وہ لوٹ گئے۔ اس وقت بھی ان پر شدید خوف چھایا ہوا تھا۔ ان سے کہا گیا کہ سانپ کو ہاتھ سے پکڑ لو ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ ہم اس کو پھر پہلی حالت میں لوٹا دیں گے۔ حضرت موسیٰؑ اس وقت بالوں کا ایک جبہ پہنے ہوئے تھے۔ آپ نے جبہ کا ایک کونا ہاتھ میں لپیٹ لیا۔ فرشتے نے کہا کہ اللہ نے جب کہہ دیا ہے تو پھر ڈرنے کی کیا بات ہے؟ اگر اللہ چاہے گا تو کیا تم ہاتھ پر کپڑا لپیٹ لینے سے بچ جاؤ گے۔ موسیٰؑ نے کہا: نہیں، لیکن کم زور ہوں، میری پیدائش ہی ضعف سے ہوئی ہے، پھر ہاتھ سے کپڑا ہٹا دیا اور ہاتھ سانپ کے منھ پر رکھ دیا۔ اس وقت بھی حضرت موسیٰؑ سانپ کے دانتوں کی کٹ کٹاہٹ سن رہے تھے۔ پھر بھی ہمت کر کے پکڑ لیا تو دیکھا کہ ان کا وہی

عصا ہے جو ہمیشہ ان کے ہاتھ میں رہتا تھا۔ ان کا ہاتھ اسی دوشاخہ پر تھا جس پر وہ ٹیک لگایا کرتے تھے۔ اسی کو قرآن پاک میں کہا گیا ہے: قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِيدُهَا سِيرَتَهَا الْأُولٰى (طٰہٰ:۲۰) ''فرمایا بے خوف ہوکر اسے پکڑے ہم اسے اسی پہلی سی صورت میں دوبارہ لادیں گے۔''[۳۱]

گزشتہ تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ اسرائیلیات نے دین اسلام کی تصویر مسخ کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ مولانا اسیر ادروی کی مذکورہ کتاب اپنے موضوع پر بہت اہمیت کی حامل ہے۔ اس سے ان کا تحقیقی مزاج جھلکتا ہے۔ تحقیق کو معروضیت، تحمل اور وسعتِ مطالعہ درکار ہے۔ یہ سب چیزیں ان کو میسر تھیں۔ مراجع تک رسائی کے بعد ہی ایسی علمی و تحقیقی کتاب ترتیب دینا ممکن ہے۔ انہوں نے معتبر مآخذ کا استعمال کیا۔ قرآنیات اور احادیث کے مباحث پر انہیں گرفت حاصل تھی۔ اسرائیلیات پر اسی وقت نقد ممکن ہے جب محقق رموز قرآن سے واقف ہو۔ اسرائیلیات کے مباحث کے کھوکھلے پن کا انکشاف اسی وقت ممکن ہے جب تاویل آیات سے وہ باخبر ہو۔ مولانا ادروی نے اسرائیلی روایات پر نقد کرنے کے ساتھ آیات کی صحیح تاویل پیش کی ہے۔ مثلاً 'فَتَلَقّٰى آدَمُ مِن رَّبِّهِ كَلِمٰتٍ' میں کلمات سے کیا مراد ہے؟ انہوں نے اس کی عمدہ تشریح کی ہے۔ اسی طرح 'وَكَتَبنَا لَهُ فِي الأَلوَاحِ' میں الواح کا کیا مفہوم ہے؟ اس کی مدلل توضیح کی ہے۔ سورۂ یوسف میں 'هَمَّت بِهِ وَهَمَّ بِهَا' کی تفسیر کرتے ہوئے اس کی درست تفصیل بیان کی ہے۔ سورۂ کہف میں 'ذوالقرنین' کی مناسب تصریح کرتے ہوئے اسرائیلیات کے نقائص کو منظر عام پر لانے کی سعی کی ہے۔ سورۂ 'جن' میں لفظ 'نَعجَة' کی تشریح کرتے ہوئے قرآن کریم کی روشنی میں اسرائیلی روایات کو باطل قرار دیا ہے۔ مولانا نے تاویلاتِ آیات کے ضمن میں جو طریقۂ کار اختیار کیا ہے وہ مفسرین کے لیے ایک رہ نما اصول ہے، جس کی مدد سے اسرائیلیات سے بچا جاسکتا ہے اور تفسیرِ قرآن میں درست نقطۂ نظر اختیار کیا جاسکتا ہے۔

مولانا ادروی نے اسرائیلیات کی تردید میں اردو تفاسیر سے مدد لی ہے اور مفسرین کے نقطہ ہائے نظر سے استدلال کیا ہے۔ انہوں نے مولانا محمد شفیعؒ، مولانا شبیر

احمد عثمانیؒ، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا محمود حسنؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ اور مولانا عبدالحق حقانیؒ وغیرہ کی تفاسیر سے استفادہ کیا ہے۔ اگر ان کے پیش نظر سرسید احمد خاںؒ، مولانا حمیدالدین فراہیؒ اور مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی تفاسیر بھی ہوتیں تو کتاب کا وزن بڑھ جاتا۔ یہ وہ مفسرین ہیں جنھوں نے تدبر قرآن کی راہیں ہموار کی ہیں۔ یہ تفاسیر کسی خاص مکتب فکر کی نمائندگی نہیں کرتیں۔ اس کتاب کے مباحث سے نمایاں ہے کہ مولانا ادروی نے ایک طرف تو ان مآخذ سے استفادہ کیا ہے جن سے اسرائیلیات کی قلعی کھلتی ہے اور ان چند تفاسیر کے حوالے دیے ہیں جن میں اسرائیلیات کو بطور مآخذ استعمال کیا گیا ہے۔ مولانا نے مختلف مقامات پر اپنے درد کا اظہار کیا ہے کہ اسرائیلی روایات کا تفاسیر میں آنا اور تاویل آیات کے تعلق سے انھیں معاون تصور کرنا قرآنی حقائق سے انحراف ہے۔ مولانا نے ان روایات کا انتخاب کیا اور ان کے نصوص نقل کر کے ان کے نقائص کو طشت از بام کیا۔ ان کے تبصرے بڑے وقیع ہیں، جن سے ان کی علمی گرفت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ کتاب ایک ایسی شاہ کار ہے، جس سے موضوع روایات کے بارے میں حساسیت رونما ہوتی ہے ۔ اس حقیقت کا اعتراف بھی بجا ہوگا کہ مولانا کا مطالعۂ حدیث بھی لائق ستائش ہے۔ یہ کتاب اپنے موضوع پر انفرادیت کی حامل ہے۔ اس سے قرآنیات کے میدان میں علم وتحقیق کے نئے گوشے سامنے آتے ہیں۔

## حواشی ومراجع


۱۔ ملاحظہ کیجیے: میزان القرآن، الطاف احمد اعظمی، ایچ ایس آفسیٹ پریس، چاندمحل دہلی-۲، جولائی ۲۰۱۳ء، ۳/۱۰۴۸-۱۰۵۰

۲۔ وضاحت کے لیے دیکھیے: الخطبات الاحمدیۃ، سرسید احمد خاں، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ، ۲۰۰۳ء ص: ۳۳۹

۳۔ ترقیم فی قصۃ اصحاب الکہف والرقیم، سرسید احمد خاں، ریاض ہند، علی گڑھ، ۱۹۱۰ء، صفحات: ۶۹

۴۔ مطالعاتِ سرسید، ابوسفیان اصلاحی، پبلی کیشن ڈویژن، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ، اکتوبر

۲۰۱۳ء،ص: ۹۸-۱۱۰

۵۔ خطبات احمدیہ کا مطالعہ (خطباتِ احمدیہ: تحلیل وتجزیہ از ابوسفیان اصلاحی)،ص: ۴۸-۴۹

۶۔ وضاحت کے لیے دیکھیے: علامہ حمیدالدین فراہی (ترجمہ: مولانا امین احسن اصلاحی)، دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڑھ، یوپی، ۱۹۹۹ء، صفحات: ۱۸۲

۷۔ تفسیروں میں اسرائیلی روایات، مولانا اسیر ادروی، مرکز دعوت اسلام (جمعیۃ علماء ہند)، دیوبند، یوپی ۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۵ء،ص: ۱۱-۱۲

۸۔حوالۂ سابق،ص: ۱۵۷ ۹۔ حوالۂ سابق،ص: ۱۵۸

۱۰۔حوالۂ سابق،ص: ۱۵۹ ۱۱۔ حوالۂ سابق،ص: ۱۶۰-۱۶۱

۱۲۔حوالۂ سابق،ص: ۱۶۳

۱۳۔ سرسید نے امہات الکتب کا جائزہ لیتے ہوئے جس طرز پر اصحاب کہف سے متعلق لایعنی مباحث پر تنقید کی ہے، اس کی مثال تفسیری ادب میں مفقود ہے۔

۱۴۔ تفسیروں میں اسرائیلی روایات،ص: ۱۹۴

۱۵۔ ارض القرآن، مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، یوپی، دسمبر ۲۰۰۳ء

۱۶۔ ملاحظہ کیجیے: قصص القرآن، مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی، ندوۃ المصنّفین دہلی، طبع سوم ۱۳۷۲ھ/۱۹۵۲ء، ۳/۲۵۰-۲۸۵

۱۷۔تفسیروں میں اسرائیلی روایات،ص: ۱۹۶ ۱۸۔ حوالۂ سابق،ص: ۲۵۲

۱۹۔حوالۂ سابق،ص: ۲۵۳ ۲۰۔ حوالۂ سابق،ص: ۲۶۵

۲۱۔حوالۂ سابق،ص: ۲۷۵-۲۷۶ ۲۲۔ حوالۂ سابق،ص: ۳۱۷-۳۱۸

۲۳۔حوالۂ سابق،ص: ۳۲۸ ۲۴۔ حوالۂ سابق،ص: ۳۳۹

۲۵۔حوالۂ سابق،ص: ۳۳۲ ۲۶۔حوالۂ سابق،ص: ۳۳۴-۳۳۵

۲۷۔ ملاحظہ کیجیے: تدبر قرآن، امین احسن اصلاحی، تاج کمپنی، دہلی، بار اول، ۱۹۸۹ء، ۱/۸۲-۸۵

۲۸۔ ملاحظہ کیجیے: خطبات احمدیہ کا مطالعہ (ترتیب: ڈاکٹر عبیداللہ و پروفیسر سید لطیف حسین شاہ کاظمی)، سیرت کمیٹی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۲۰۱۶ء، ۱/۱۴۳۷ھ،ص: ۳۳-۳۴

۲۹۔ حوالۂ سابق،ص: ۳۳۹ ۳۰۔حوالۂ سابق،ص: ۳۴۶-۳۴۷

۳۱۔ حوالۂ سابق،ص: ۳۴۸-۳۴۹

## تعارف وتبصرہ

The Foreign Vocabulary of the Qur'an — آرتھر جیفری

ناشر:حضرت پیر محمد شاہ لائبریری اینڈ ریسرچ سینٹر، احمد آباد، گجرات ، سنۂ اشاعت:۲۰۲۳ء، صفحات:۳۷۶، قیمت ـ/۶۰۰ روپے

یہ کتاب(The Foreign Vocabulary of the Qur'an) سب سے پہلے ۱۹۳۸ء میں مہاراجہ گائیکواڑ آف بڑودہ کی جانب سے اورینٹل انسٹی ٹیوٹ بڑودہ سے شائع ہوئی تھی۔اس کے بعد اس کے بہت سے ایڈیشن منظرعام پر آئے۔اب پروفیسر محی الدین بامبے والا، ڈائریکٹر حضرت پیر محمد شاہ لائبریری اینڈ ریسرچ سینٹر احمد آباد نے اس کا نیا ایڈیشن اپنی لائبریری سے طبع کرایا ہے۔

مستشرقین نے قرآن مجید پر غیر معمولی کام کیا ہے۔انہوں نے اس کی تاریخِ تدوین، اختلافِ قراءات، سابقہ کتبِ سماوی سے موازنہ، اس میں غیر عربی زبانوں کے الفاظ کی موجودگی اور علوم قرآن کے دیگر موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے اور کتابیں لکھی ہیں۔لیکن تقریباً تمام مستشرقین کا اندازِ تحقیق جانب دارانہ، بلکہ معاندانہ ہے۔وہ قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ کی کتاب نہیں مانتے، بلکہ اسے آپؐ کی تصنیف قرار دیتے ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ آپؐ لکھنا پڑھنا جانتے تھے، آپؐ نے یہودی اور عیسائی علماء سے ملاقات کرکے ان سے استفادہ کیا، ان کے افکار اخذ کیے اور قرآن تصنیف کرنے میں ان سے مدد لی۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ آپؐ قرآن پر نظر ثانی اور اس کی عبارتوں کو بہتر بنانے کے لیے کانٹ چھانٹ کرتے رہتے تھے، لیکن اسے کتابی صورت میں مرتب و مدوّن کرنے سے پہلے آپ کا انتقال ہوگیا۔

قرآنیات پر کام کرنے والے مستشرقین میں آرتھر جیفری کو شہرت حاصل ہے۔ وہ پروٹسٹنٹ عیسائی تھا۔۱۹۱۲ء میں اس کا تقرر قاہرہ کے اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز میں سامی زبانوں کے استاد کی حیثیت سے ہوا۔۱۹۳۸ء سے اپنی وفات تک اس نے کولمبیا یونی ورسٹی میں تدریسی خدمات انجام دیں اور یونین تھیالوجیکل سیمینری، نیویارک سٹی سے

بھی جزوقتی استاد کے طور پر وابستہ رہا۔قرآنی موضوعات پر اس کی متعدد تصانیف ہیں۔

دیگر مستشرقین کی طرح آرتھر جیفری نے بھی اپنی تصانیف میں یہ ثابت کرنے میں اپنا زورِ قلم صرف کیا ہے کہ قرآن مجید حضرت محمد ﷺ کی تصنیف ہے۔اس کا خیال ہے کہ آپؐ اِدھر اُدھر سے کچھ تحریری مواد جمع کر کے اس کی چھان پھٹک کرتے رہے، تاکہ ایک مرتب کتاب کی صورت میں اسے تیار کر کے لوگوں کے سامنے پیش کرسکیں،لیکن آپؐ کی وفات کی وجہ سے اس کی نوبت نہ آسکی۔بعد میں خلیفۂ سوم حضرت عثمان بن عفانؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں اسے مرتب کروایا۔جیفری نے ان یہودی اور عیسائی مآخذ کی نشان دہی کرنے کی بھی کوشش کی ہے جن سے،اس کے زعم کے مطابق،آپؐ نے قرآن کی تصنیف میں استفادہ کیا ہے۔اس نے قرآنی قراءتوں کے درمیان فرق کو بہت زیادہ نمایاں کر کے پیش کیا ہے۔وہ کہتا ہے کہ صحابۂ کرام نے قرآن مجید کے جو ذاتی نسخے تیار کیے تھے ان میں فرق تھا۔حضرت عثمانؓ نے اگرچہ اس فرق کو مٹانے کی بہت کوشش کی، لیکن اس میں کام یاب نہ ہوسکے۔اس نے پندرہ(۱۵)صحابہ اور تیرہ(۱۳) تابعین کے ایسے نسخوں کا تعارف کرایا ہے جو مصحفِ عثمانی سے مختلف تھے اور ان میں بہت زیادہ اختلاف پائے جاتے تھے۔اس طرح وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ قرآن کا کوئی مستند نسخہ موجود نہیں ہے اور اب بھی اس کے نسخوں میں بہت فرق پایا جاتا ہے۔

زیرتبصرہ کتاب پر جیفری نے ایک مبسوط مقدمہ(۴۰ صفحات) لکھا ہے، جس میں قرآن مجید کے بارے میں اپنے خیالات تفصیل سے تحریر کیے ہیں۔اس کے نزدیک حضرت محمد ﷺ نے قرآن تصنیف کرنے کے لیے یہود و نصاریٰ سے مواد حاصل کیا اور عربی زبان کے علاوہ دیگر زبانوں سے بھی استفادہ کیا۔اس کے بعد اس نے قرآن مجید کے دوسو پچھتّر(۲۷۵)الفاظ حروفِ تہجی کی ترتیب سے پیش کیے ہیں، جو اس کے خیال میں دیگر زبانوں کے ہیں اور حضرت محمد ﷺ نے انہیں یہودیت،نصرانیت، مجوسیت اور عرب کی مقامی روایات سے مستعار لے کر قرآن میں شامل کیا ہے۔بعض الفاظ سے متعلق اس کا دعویٰ ہے کہ انہیں حضرت محمد ﷺ نے خود ایجاد کیا تھا۔اس کا یہ بھی دعویٰ

ہے کہ نبی کریم ﷺ سے قرآن کی تفسیر مروی نہیں ہے۔اس کا ثبوت یہ ہے کہ مفسرین متعدد الفاظِ قرآن کے معانی سے ناواقف تھے۔انہوں نے ایک لفظ کے کئی معانی بتائے ہیں۔وہ بیان کرتا ہے کہ قرآن کی زیادہ تر تفسیری روایات حضرت عبداللہ بن عباسؓ (م ۶۸ھ) سے مروی ہیں، جنہوں نے کعب الاحبار (م ۳۲ھ) سے استفادہ کیا تھا۔اس طرح وہ یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ تفسیری ورثہ کی عمارت یہودی روایات پر قائم ہے۔

جیفری کے مطابق حضرت محمد ﷺ نے جن زبانوں سے استفادہ کیا تھا ان میں حبشی، فارسی، رومی، ہندوستانی، سریانی، عبرانی، نبطی، قبطی، ترکی اور افریقی (زنجی، بربری) زبانیں شامل ہیں۔اس نے ان زبانوں کا تعارف کرانے کے بعد اس امر کا جائزہ لیا ہے کہ کس زبان سے نبی ﷺ نے کس طرح ان الفاظ کو قرآن میں شامل کیا۔مثلاً وہ لکھتا ہے کہ آپؐ نے عرب میں موجود بعض حبشیوں سے ان کی زبان کے الفاظ سیکھے اور انہیں قرآن میں شامل کر دیا۔آپؐ یہود کے ایک تعلیمی ادارے (بیت المِدراس) گئے تھے، جہاں سے، ممکن ہے، عبرانی زبان سیکھی ہو۔آپؐ کے تعلقات عیسائی راہبوں، مثلاً بحیرا، نسطورا اور قس بن ساعدہ وغیرہ سے تھے، جن سے آپؐ نے سریانی زبان سیکھی۔قبطی زبان کی واقفیت آپؐ کو ماریہ قبطیہؓ سے ہوئی، جو آپؐ کے حرم میں داخل تھیں۔ہندوستانی اور افریقی زبانوں کے تعلق سے اس نے دعویٰ کیا ہے کہ مفسرین کو جن الفاظ کے معانی نہیں معلوم ہوتے تھے ان کے بارے میں اپنی لاعلمی چھپانے کے لیے کہہ دیتے تھے کہ وہ ان زبانوں کے الفاظ ہیں۔زبانوں کے تذکرے کے بعد وہ لکھتا ہے کہ حضرت محمد ﷺ کا یہود ونصاریٰ سے معلومات اخذ کرنا شک وشبہ سے بالاتر ہے۔انہوں نے ان دونوں ذرائع سے بہت سی معلومات حاصل کیں اور انہیں قرآن میں شامل کر دیا۔

قرآن مجید میں غیر عربی زبانوں کے الفاظ کی موجودگی کو مستشرقین نے جس انداز سے پیش کیا ہے اور آرتھر جیفری نے جس طرح اسے علمی رنگ دے کر انسانی کاوش قرار دینے کی کوشش کی ہے، اس سے ان کے جانب دارانہ اور متعصّبانہ رجحان کی غمّازی ہوتی ہے۔متعدد علمائے کرام قرآن میں غیر عربی زبانوں کی موجودگی کے قائل رہے ہیں،

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے کسی انسان نے ان زبانوں اور مختلف مذاہب کی نمائندہ شخصیات اور مذہبی کتابوں سے استفادہ کر کے تصنیف کیا ہے۔زبانوں کا ایک دوسرے سے استفادہ ایک معروف حقیقت ہے۔عربوں کا زمانۂ قدیم میں جن قوموں سے رابطہ اور اختلاط ہوا ان کی زبانوں سے انہوں نے بعض الفاظ اخذ کیے اور ان میں معمولی تبدیلی کر کے اپنی زبان میں شامل کرلیا اور انہیں اپنے اشعار اور محاوروں میں استعمال کرنے لگے۔چنانچہ وہ الفاظ عربی الفاظ جیسے ہوگئے اور ان میں قرآن مجید نازل ہوا۔ اس کے علاوہ یہ بھی حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دین ایک ہی ہے۔پہلے انسان اور پہلے نبی حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ تک تمام انبیاء کی بنیادی تعلیمات ایک ہی تھیں۔اس بنا پر اگر یہودیت،عیسائیت اور اسلام کی بعض تعلیمات میں یکسانیت نظر آتی ہے تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ حضرت محمد ﷺ نے یہودیت اور عیسائیت سے استفادہ کر کے ان کی بعض تعلیمات کو اپنا بنا کر پیش کیا ہے۔

جیفری کی اسلام دشمنی اور قرآن مجید سے متعلق اس کا معاندانہ رویہ اپنی جگہ، لیکن ایک دوسرے پہلو سے اس کتاب کی اہمیت ہے،وہ ہے اس کا لسانی پہلو۔جیفری نے قرآن مجید کے جن الفاظ کو غیر عربی زبانوں سے ماخوذ بتایا ہے ان کی اصل تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ان الفاظ کو اصل املا کے ساتھ درج کیا ہے۔ان میں آنے والے تغیرات کا تذکرہ کیا ہے۔ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل ہوتے وقت تک ان کے معانی میں ہونے والی تبدیلیوں کی جانب بھی اشارہ کیا ہے۔خاص طور سے سامی زبانوں میں ایک دوسرے سے کس حد تک لین دین ہوا ہے؟اس پر اس کی معلومات وسیع ہیں۔اس موضوع پر اس نے تفصیلی بحثیں کی ہیں۔اس کی تحقیقات کی روشنی میں اس موضوع کو آگے بڑھایا اور اس پر مزید کام کیا جاسکتا ہے۔ظاہر ہے،اس کی تمام تحقیقات حرفِ آخر نہیں ہیں،ان میں غلطیوں کا امکان ہے۔بعد کے محققین نے ان میں کچھ غلطیوں کی نشان دہی کی ہے۔مثال کے طور پر کیتھرائن پِنّا کیو(Catherine Pennacchio) نے اپنے مقالے Lexical Borrowing in the qru'an : The problematic Aspects of Arthur Jeffery;s list میں جیفری کے مباحث اور نتائجِ تحقیق کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔

(محمد رضی الاسلام ندوی)

## مسلم علماء کا مطالعۂ ہندوستان — ڈاکٹر ظفر دارک قاسمی

ناشر: خسرو فاؤنڈیشن، ڈی۔۳۱۹، ڈیفنس کالونی نئی دہلی۔۲۵، سنۂ اشاعت: ۲۰۲۳ء، صفحات: ۳۴۲، قیمت ۳۵۰؍روپے

موجودہ دور میں مختلف اقوام و مذاہب کے درمیان بڑھ رہی دوٗری اور غلط فہمیوں کا تقاضا ہے کہ مختلف مذاہب کے مابین مشترک قدروں کو تلاش کیا جائے۔ چنانچہ قرآن مجید اور احادیثِ نبوی میں اس حوالے سے کافی کچھ مواد ہے۔قرآن مجید میں مختلف قوموں اور ان کی ہدایت کے لیے بھیجے گئے انبیاء ورسل کے حالات وواقعات بیان کیے گئے ہیں، محدثین نے اپنی کتابوں میں مستقل ابواب قائم کرکے مختلف انبیاء و رسل کے واقعات درج کیے ہیں،اسی طرح علماء اسلام نے اپنی کتبِ تاریخ وسیر میں مختلف ادیان و مذاہب پر مواد فراہم کیا ہے۔تاریخِ طبری، البدایہ والنہایۃ لابن کثیر، الکامل فی التاریخ لابن اثیر، ابن خلدون کا مقدمہ اور ان کی کتاب العبر ودیوان المبتدأ والخبر ، ابوریحان البیرونی کی کتاب تحقیق ماللھند، ابن حزم کی کتاب الفِصَل فی الملل و الاھواء والنحل، شہرستانی کی کتاب الملل والنحل، ابن تیمیہ کی کتاب الجواب الصحیح لمن بدّل دین المسیح، ابن قیم الجوزیہ کی کتاب ہدایۃ الحیاریٰ فی أجوبۃ الیہود والنصاری، رحمت اللہ کیرانوی کی کتاب اظہار الحق، عنایت اللہ چریاکوٹی کی کتاب بشریٰ، یہ سب تقابلِ ادیان پر ہیں۔ ان کے ذریعے علماء اسلام نے دوسرے مذاہب وادیان کو سمجھنے کی سنجیدہ کوششیں کی ہیں۔زیرتبصرہ کتاب ان علماء کی کاوشوں پر مشتمل ہے جنہوں نے خاص طور سے ہندو دھرم کو سمجھنے اور اس کا تقابلی مطالعہ پیش کرنے کی سعی مشکور کی ہے۔

یہ کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب 'مسلمان، مطالعۂ ادیان اور سماجی ہم آہنگی' کے عنوان سے ہے۔دوسرے باب کا عنوان ہے: 'ہندوستان کی مسلم حکومتوں میں ہندو دھرم کا احیاء اور تحفظ'۔ تیسرا باب 'مسلم علماء، ہندو دھرم اور تکثیریت' پر ہے۔

باب اول میں فاضل مصنف نے تقابل ادیان، خصوصاً ہندوستانی مذاہب پر مسلم علماء اور اسکالرز کے تحقیقی کاموں کا جائزہ لیا ہے۔ان کے مطابق اب تک ایک سو

کے قریب کتابیں ہندوستانی مذاہب پر اردو زبان میں مسلم علماء نے تحریر کی ہیں۔ان سے واضح ہوتا ہے کہ ہندوستانی مذاہب کا مطالعہ مختلف مقاصد اور نوعیّتوں سے اور خالص علمی وتحقیقی اسلوب میں کیا گیا ہے۔ ہندوستانی مذاہب کا تقابلی مطالعہ کرنے والے نمایاں علماء میں مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا ابوالوفاء ثناءاللہ امرتسری، خواجہ حسن نظامی، ڈاکٹر ذاکر نایک، شیخ احمد دیدات، مولانا عبدالصمد رحمانی، مولانا سید حامد علی، مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی، علامہ شبلی نعمانی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا سید ابوالاعلی مودودی، مولانا ابوالکلام آزاد، جناب سید امیر علی ،ڈاکٹر محمد حمید اللہ پیرس، مولانا عبدالماجد دریابادی، قاضی محمد سلیمان منصور پوری اور مولانا مناظر احسن گیلانی رحمہم اللہ قابلِ ذکر ہیں۔ان کی تصانیف میں ہندوستانی مذاہب کے حوالے سے کافی مواد موجود ہے۔

دوسرے باب میں فاضل مصنف نے مسلم دورِ حکم رانی میں بین المذاہب مذاکروں اور مکالموں کی تاریخ بیان کی ہے، پھر ہندومت پر تیار کردہ متعدد کتب کے حوالے دیے ہیں ،جن میں کتاب الہند، دبستانِ مذاہب، آئین اکبری، منتخب التواریخ، مجالس جہاں گیری اور تزک جہاں گیری خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

تیسرے باب میں ادیان ومذاہب کے درمیان اختلاف کی حقیقت کا جائزہ لیا گیا ہے۔فاضل مصنف نے عنوان 'مسلم علماء، ہندو دھرم اور تکثیریت' کے تحت اسلام اور ہندو دھرم کی مشترکہ اقدار کو تلاش کرنے کی سعی کی ہے۔انھوں نے اس سوال سے بھی بحث کی ہے کہ کیا ہندو 'شبہ اہل کتاب' ہیں؟

مجموعی طور پر یہ کتاب عصر حاضر کی ایک اہم ضرورت کی تکمیل کرتی ہے۔اس کے ذریعے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان بڑھ رہی دوٗری اور نفرت کو کم کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔اس کا مطالعہ علماء اور دانش وروں سمیت تمام ہندوستانیوں کے لیے مفید ہے۔

(محمد جرجیس کریمی)

# خبر نامہ ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی (۸۷)

☆ **صدرِادارہ کا کلیدی خطبہ:** ۱۸/ مارچ ۲۰۲۳ء کو شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ میں 'سائنس اور ٹکنالوجی میں خواتین کی خدمات' کے عنوان سے سمینار / ویبنار منعقدا ہوا۔ صدرِ ادارہ مولانا محمد رضی الاسلام ندوی نے اس میں شرکت کی اور کلیدی خطبہ پیش کیا۔

☆ **اصلاحِ معاشرہ پر صدرِ ادارہ کے کتابچوں کی اشاعت:** مولانا محمد رضی الاسلام ندوی سماجی اور عائلی مسائل پر مسلسل لکھتے رہتے ہیں۔ ان پر آپ کی مستقل تصانیف بھی ہیں۔حال میں آپ کے سات مختصر کتابچے شعبۂ اسلامی معاشرہ، جماعت اسلامی ہند کی جانب سے شائع کیے گئے ہیں: (۱) نکاح کو آسان بنائیے۔(۲) آسان نکاح کے قابل تقلید نمونے۔(۳) خوش گوار خاندان کیسے؟۔(۴) خاندانی تنازعات کیسے دؤر کریں؟ (۵) طلاق وخلع (۶) خواتین کو وراثت دیجیے۔(۷) اصلاحِ معاشرہ کے لیے جماعتِ اسلامی ہند کی کوششیں۔

☆ **شعبۂ دینیات میں سکریٹری ادارہ کی شرکت:** ۴-۵/ مارچ ۲۰۲۳ء کو شعبۂ دینیات (سنی) مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں دوروزہ قومی سمینار بعنوان 'بیسوی صدی کی قرآنی خدمات' منعقدا ہوا۔ اس میں سکریٹری ادارہ مولانا اشہد جمال ندوی نے 'مدرستہ الاصلاح کی قرآنی خدمات' کے عنوان پر مقالہ پیش کیا۔آپ نے مدرسۃ الاصلاح کے تدریس قرآن کے منہج ونصاب اور اصلاحی فضلاء کی قرآنی خدمات پر سیر حاصل بحث کی۔

☆ **زیرِ تربیت اسکالرس کا سمینار:** ۱۵/جنوری ۲۰۲۳ء کو مولانا محمد رضی الاسلام ندوی کی صدارت میں 'اقامت دین: مفہوم اور تقاضے (تحریکی لٹریچر کے تناظر میں)' کے مرکزی عنوان پر ادارہ کے زیرِ تربیت اسکالرس کا سمینار منعقد ہوا۔انھوں نے 'اقامتِ دین: قرآنی مفہوم اور دلائل، اقامتِ دین: جہات اور مراحل، اقامتِ دین اور غلبۂ دین، اور اصطلاح اقامتِ دین پر اعتراضات۔ایک جائزہ' کے عنوانات پر اپنے

مقالات پیش کیے۔ مقالات کی خواندگی کے بعد سوال وجواب کا بھی موقع دیا گیا۔ صدرِ ادارہ نے اپنی گفتگو میں مقالات کی عمدہ پیش کش پر اسکالرس کو مبارک باد دی۔

☆ **جماعت اسلامی ہند کی خدمات پر سمینار:** ۲۱/مارچ ۲۰۲۳ء کو ادارہ میں 'جماعت اسلامی ہند کی علمی وفکری خدمات کا جائزہ' کے عنوان سے پروفیسر ضیاء الدین ملک فلاحی کی صدارت میں یک روزہ سمینار کا انعقاد ہوا۔ اس میں ادارۂ تحقیق اور ادارۂ علوم القرآن کے محققین اور اسکالرس نے شرکت کی۔ مقالہ نگاروں کے نام اور عناوین یہ ہیں: سالم برجیس ندوی (قرآن کریم سب کے لیے: جماعت کی منفرد کوششوں کا جائزہ)، مولانا محمد کمال اختر قاسمی (جماعت اسلامی اور خدمتِ حدیث)، سالم فاروق ندوی (اقامتِ دین کی قرآنی بنیادیں)، محمد رویدفلاحی (اسلامی نظام حیات کا تصور: تحریکی لٹریچر کے تناظر میں)، محمد صادر ندوی (تحریکی لٹریچر میں بنیادی عقائد کی تشریح وتوضیح)، محمد طارق بدایونی (تحریک اسلامی کا ترجمان: ماہ نامہ زندگی نو)، مولانا محمد جرجیس کریمی (غیر مسلموں میں دعوتِ دین: تحریکی لٹریچر کا جائزہ) اور محمد انس مدنی (تحریکی لٹریچر کے روشن پہلو)۔ آخر میں صدرِ سمینار نے تمام مقالات پر تبصرہ کیا اور عمدہ پیش کش پر شرکاء کو مبارک باد دی اور تشجیعی انعامات بھی دیے۔

☆ **مجلس علمی کی نشست:** ۱۹/ مارچ ۲۰۲۳ء کو ادارہ کی مجلس علمی کی نشست پروفیسر سید مسعود احمد کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ اس میں مجوزہ سمینار کا مرکزی موضوع 'حیات اور کائنات' طے کیا گیا۔ اس کے انعقاد کے لیے ۲۵-۲۶ نومبر ۲۰۲۳ء کی تاریخ طے کی گئی ہے۔ ذیلی عناوین ترتیب دینے کے لیے ایک مشاورتی کمیٹی تشکیل دی گئی ہے۔ سمینار کی تیاری جاری ہے۔

☆ **مرکزِ علوم القرآن کے سمینار میں مولانا محمد جرجیس کریمی کی صدارت:** ۶-۷/مارچ ۲۰۲۳ء کو پروفیسر خلیق احمد نظامی مرکزِ علوم القرآن میں دوروزہ سمینار 'نوجوانوں میں قرآن فہمی کی عملی تدابیر' کے موضوع پر منعقد ہوا۔ اس کے تیسرے اجلاس کی صدارت مولانا محمد جرجیس کریمی نے کی۔

☆ **پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی کے ساتھ ادارہ کے اسکالرس کی خصوصی نشست:** پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی کے ساتھ ہر ماہ ادارہ کے اسکالرس کی خصوصی علمی نشست کا سلسلہ جاری ہے۔۱۱/ مارچ کو آپ نے اسکالرس کی حالیہ سرگرمیوں کا جائزہ لینے کے ساتھ ادارہ میں منعقد ہونے والے یک روزہ سمینار 'جماعت اسلامی ہند کی علمی وفکری خدمات کا جائزہ' کے سلسلے میں رہ نمائی کی۔

☆ **ادارہ میں علمی شخصیات کی آمد:** الحمد للہ ادارہ میں علمی شخصیات کی آمد کا سلسلہ رہتا ہے۔۱۹/جنوری ۲۰۲۳ء کو ڈاکٹر عمیر انس فلاحی، اسسٹنٹ پروفیسر انقرہ یونی ورسٹی ترکی تشریف لائے۔ آپ نے اسکالرس کے سامنے 'سماجیات کے تحقیقی آداب' پر گفتگو کی۔ ۱۱/فروری ۲۰۲۳ء کو ڈاکٹر شمشاد حسین فلاحی ،مدیر ماہ نامہ حجاب اسلامی نئی دہلی کی تشریف آوری ہوئی۔ ان کے ساتھ ادارہ کے اسکالرس کی مختصر علمی نشست منعقد ہوئی۔

☆ **سالانہ خبرنامہ ۲۰۲۲ء کی اشاعت:** ادارہ کے بہی خواہوں کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اس کی سرگرمیوں سے باخبر رہیں۔ اسی ضرورت کی تکمیل کے لیے امسال ادارہ کا سالانہ خبرنامہ (جنوری۔دسمبر ۲۰۲۲ء) تیار کیا گیا ہے۔اس میں سال بھر کی سرگرمیوں کی ایک جھلک پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس کی پی ڈی ایف فائل درج ذیل نمبر سے حاصل کی جاسکتی ہے: +91-7417701962۔

☆ **سابق صدرِ ادارہ کے کتابچے کا ہندی ترجمہ:** سابق صدر ادارہ مولانا سید جلال الدین عمریؒ نے خدمت خلق کے موضوع پر متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ ایک کتابچہ 'انسانوں کی خدمت اسلام کی نظر میں' کے عنوان سے ہے۔اس کا کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔اب اس کا ہندی ترجمہ 'مانوسیوا (اسلام کی نظر میں)' ادارہ کے جوائنٹ سکریٹری انجینئر آفتاب حسن مظہری نے کیا ہے۔

## مولانا سید جلال الدین عمری کی

# دو اہم کتابیں

## تہذیب و سیاست کی اسلامی قدریں

آج اسلامی تہذیب کو مغربی تہذیب کے لیے ایک چیلنج سمجھا جا رہا ہے اور اس کی تصویر بگاڑنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ کبھی تو اس کے مستقل وجود ہی سے انکار کیا جاتا ہے۔ پیش نظر کتاب میں تہذیب و سیات کی تعمیر میں اسلام کا کردار، سلام، امن و سلامتی کا پیغام، تحائف کی دینی و سماجی حیثیت، اسلام اور اصول سیاست، اسلام اور سیاست، اسلام کا شورائی نظام، مغرب اور انسانی حقوق کی تحریک، اسلام اور انسانی حقوق کی ضمانت جیسے موضوعات پر اسلامی نقطۂ نظر سے گفتگو کی گئی ہے اور بعض سوالات یا اعتراضات کا جواب بھی دیا گیا ہے۔

یہ مولانا کے ان مقالات کا مجموعہ ہے جو انھوں نے مختلف مواقع پر سپرد قلم فرمائے تھے اور وہ مجلّہ تحقیقات اسلامی علی گڑھ میں شائع ہوئے۔ ان کی یکجا ترتیب سے تہذیب و سیاست کے میدان میں اسلام کے نقطۂ نظر کی عمدہ پیرائے میں وضاحت ہوتی ہے اور اس کی تعمیر میں اسلام کا انقلابی کردار نمایاں ہوتا ہے۔ **صفحات: 96 قیمت: 65 روپے**

## اسلام میں خدمتِ خلق کا تصور

خدمتِ خلق کے موضوع پر یہ ایک شاہ کار تصنیف ہے۔ اس میں درج ذیل عناوین پر بڑی عالمانہ اور تحقیقی بحث کی گئی ہے:

خدمت خلق کا صحیح تصور اور غلط تصورات کی تردید، خدمتِ خلق کا اجر و ثواب، خدمت کے مستحقین، خدمت سب کی کی جائے، وقتی خدمات، رفاہی خدمات، خدمت کے لیے انفرادی و اجتماعی کوششیں، خدمت کے لیے اخلاص کی ضرورت۔ موجودہ دور میں خدمت کے تقاضے اور ان پر عمل کی شکلیں۔ صفحات: ۱۵۴، قیمت: ۱۱۰/روپے

اس کتاب کا انگریزی، عربی ہندی، ملیالم اور تمل زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

**ملنے کا پتہ:** مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز، نئی دہلی۔ 110025

ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی، علی گڑھ۔ 202002

**ISSN:2321-8339**

Organ of Idara-e-Tahqeeq-o-Tasneef-e-Islami

Quarterly

# TAHQEEQAT-E-ISLAMI

Aligarh

Vol. 42 No.2

April - June 2023

**Editor**

**Muhammad Raziul Islam Nadvi**

## Editorial Board

1- **MI. Muhammed Farooq Khan**
Ex-Presedent Idara-e-Tahqeeq-o-Tasneef-e-Islami, Aligarh

2- **Prof. Ishtiyaq Ahmed Zilli**
Nazim Darul Musannifin Azamgarh

3- **Prof. Saud Alam Qasmi**
Dean Feculty of Theology, AMU, Aligarh

4- Prof. Israr Ahmed Khan
D/o Tafsir, University of Ankara (Turkey)

5- **Dr Muhammed Akram Nadvi**
Dean Cambridge Islamic College (UK)

6- **Ml. Ashhad Jamal Nadvi**
Secretary Idara-e-Tahqeeq-o-Tasneef-e-Islami, Aligarh

Idara-e-Tahqeeq-o-Tasneef-e-Islami

Nabi Nagar (Jamalpur)، P.O. Box: 93

ALIGARH - 202 002 (INDIA)

www.tahqeeqat.net Email: tahqeeqat@gmail.com

# CONTENTS


**1. Underage Marriage: Islamic Point of View** **5**

*Muhammad Raziul Islam Nadvi*

**2. A Critical Appraisal of the Deviations of Jews** **21**

*Hafiz Muhammad Ahsan Raza*

**3. The Shari'ah Status of a Limited Company** **35**

*Maulana Akhtar Imam Adil Qasmi*

**4. Earning of Livelihood and Islam** **61**

*Maulana Muhammad Anas Falahi Madani*

**5. Israeli Narrations in Tafsirs** **85**

*Professor Abu Sufyan Islahi*

**7. Book Review** **111**

**Activities of Idara-e-Tahqee-o-Tasneef-e-Islami** **117**

# Abstract of the Articles

## Underage Marriage:Islamic Point of View

*Muhammad Raziul Islam Nadvi*
President Idara-e-Tahqeeq-o-Tasneef-e-Islami,Aligarh
mrnadvi@gmail.com

The Prohibition of Child Marriage (Amendment) Bill 2021, tabled in the Indian Parliament towards the end of 2021, declares 21 years as the minimum age for the marriage of a girl. This Bill has been passed by the Lok Sabha; its clearance from the Rajya Sabha is yet to be done. According to the existing law, the marriage of a girl below 18 years is a punishable offence. Under the pretext of this law, thousands of men and their relatives who had married girls below 18 years in previous years, in the Northeast State of Assam, were arrested. Most of those who were arrested are Muslims. This gave the impression that the trend of underage marriage is rampant among Muslims.

This article presents the Islamic point of view on underage marriage. Islam persuades believers to get a boy or girl married soon after he or she turns adult. It helps control shamelessness, obscenity and sexual infidelity.

In a Supreme Court verdict in 2018, it was said that sex between an adult boy and an adult girl is related to Fundamental Rights in the light of Articles 14, 15, 19 and 21 of the Constitution. It means that sex between underage unmarried boy and girl is legal while after marriage it would be illegal. This shows the contradiction of laws.

## A Critical Appraisal of the Deviations of Jews

*Hafiz Muhammad Ahsan Raza*
Asstt. Professor G.C University,Faisalabad, Pakistan
ahsan.raza62@yahoo.com

The first religion from among Semitic religions is Judaism. Its followers are called Jews. Allah the Exalted sent many Prophets to the Jewish community. They executed the duty of reforming the beliefs and thoughts of people. But, with the passage of time, many deviations crept into their beliefs.

Hazrat Moosa taught them *Tawheed* (Monotheism) but they demanded false gods. When Hazrat Moosa went to Mount At-Tur, in his absencehis peoplecreated a calf statue and worshipped it. They started calling Hazrat Uzair (Ezra) a son of God. Similarly, they declared things lawful or unlawful at the bidding of their Ulama and Rahibs. Their daring augmented so much so that they started committing audacities about Allah the Exalted. They claimed that they were chosen ones of Allah; they

would be forgiven howsoever sins they might commit. Their many more misleading claims have been described in the Qur'an.

This article accentuates the beliefs and concepts of the Jews in the light of the Qur'an.

## The Shari'ah Status of a Limited Company

*Maulana Akhtar Imam Adil Qasmi*
*Jamia Rabbani, Manorwa Sharif, Bihar*
jamia.rabani@gmail.com

Limited company is a new form of doing business; however, the concept of joint venture in business is not new. When, after the Industrial Revolution in Europe in the 17th century, huge capital was required to establish large factories - which was not possible for a person individually or a group of few persons to provide - at that time a system of company was established by collecting surplus amounts of general public and benefiting therefrom collectively.

The details of joint venture in business that is found in ancient *fiqhi* (jurisprudential) literature do not fully corroborate the system of company. This is why some Ulama deem it unlawful. But some other Ulama are of the opinion that there can be different forms of joint venture in business. Its ancient forms are not definite and unequivocal, but rather they are jurisprudential explorations. Therefore, some new form based on

common law and compliance can be lawful.

This article discusses the Shari'ah status of this new form of business in the light of ancient literature of jurisprudence.

## Earning of Livelihood and Islam

*Maulana Muhammad Anas Falahi Madani*
*Member Idara Tahqeeq-o-Tasneef-e-Islami Aligarh*
anasfalahi@gmail.com

To ensure the natural growth of human life, Islam provides means to fulfil the demands of soul and body both. The basic need of body is food. Its ample arrangement has been made in the universe. Islam gives clear guidelines on livelihood, sources of livelihood and expenditure of wealth. The Qur'an persuades believers to struggle for livelihood. In the Hadith, wealth has been deemed Allah's bounty and persuasion has been made to earn livelihood. The refuge of Allah has been sought against poverty and hunger. A giving hand has been declared as superior to a receiving hand. The Messenger of Allah has taught supplications for increase in livelihood. Muslim thinkers like Imam Abu Hanifa, Imam Muhammad, Allama Ibn Qayyim and Imam Ghazali, etc. have made detailed studies on the virtues of struggle for livelihood as well as on the watchful care of *halal* (lawful) and *haram* (unlawful). The logical conclusion of the commands on Zakat and Sadaquat is that one should earn

wealth so that he may be able to give Zakat.

In this article sufficient deliberation has been made on all these aspects of earning livelihood with reference to the Qur'an, Hadith and Muslim theologians.

## Israeli Narrations in Tafsirs

*Dr.Abu Sufyan Islahi*
Professor, Dept. of Arabic,
Aligarh Muslim University,Aligarh
asislahi@gmail.com

Israelism means the narrations that have come to us through the Jews and Christians. *Mufassirs* (commentators of the Qur'an) have been in the habit of relating all the narrations that have come to them with *sanads* while explicating an *Ayah*. These narrations have been related by the Companions and *Tabi'een* who had been earlier Jews or Christians. These narrations were baseless and groundless which had no relation with the *tafsir* of the Qur'an ; but many ancient and modern *mufassirs* have mentioned them in their books.

Among the modern-day Ulama, Maulana Aseer Adravi has written considerable works on the various aspects of Islamic studies. One of his books is entitled "*Tafseeron Main Israeli Riwayaat*". Under the Qur'anic stories, he has analysed Israeli narrations and also mentioned the tafsirs that have carried these narrations. The Maulana has written that these narrations have

nothing to do with the tafsir of the Qur'an.

This article presents a study of the said book of Maulana Aseer Adravi, and carries a gist of his discussions. Mentioning his criticisms, it also highlights the importance of this book.

## BOOK REVIEW

1. *The Foreign Vocabulary of the Qur'an*, Arthur Jeffery , Hazrat peer Mohd. Shah Library and research centre, Ahmdabad, Gujrat,2023, Pages:376,Price:IRs.600/-

Reviewed by Dr.Mohd Raziul Islam Nadvi

2. *Muslim Ulama ka Mutalae Hindustan*,(Muslim Scholer's Study of India), Dr. Zafar Darik Qasmi, Khusru Foundation, D-319, Defence Colony, New Delhi-110025, 2023, Pages:350, Price:IRs.342/-

Reviewed by Maulana Mohd. Jarjees Karimi

# مختصر
# مشکاۃ المصابیح

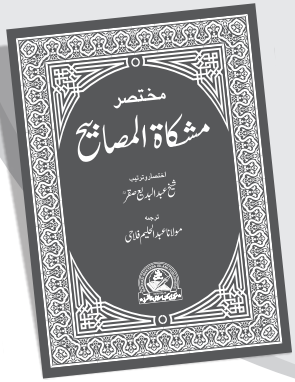


اختصار و ترتیب
شیخ عبدالبدیع صقرؒ

ترجمہ
مولانا عبدالحلیم فلاحی

یہ اصلاً امام بغوی کی کتاب مصابیح السنۃ کی ترتیبِ نو اور تہذیبِ جدید ہے۔ یہ کام علامہ خطیب تبریزی نے کیا ہے۔ انھوں نے نئے سرے سے اس کی ترتیب و تہذیب کے ساتھ نہایت عمدہ طریقے سے ابواب و فصول کی تقسیم کی اور کچھ احادیث کا اضافہ بھی کیا۔

اس کتاب میں 1277 احادیث ہیں۔ انہیں 6 ابواب: عقائد، عبادات، اخلاق، سیاست، معاشیات اور اجتماعیات میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ابتدا میں مشکوٰۃ کا تعارف اور فن حدیث کی بعض اصطلاحات کی تشریح مترجم کے قلم سے ہیں اور ایک مبسوط مضمون مصنف کے قلم سے ہے، جس میں حدیث نبوی کی اہمیت، فتنۂ وضع حدیث کے اسباب اور حفاظتِ حدیث کے لیے علما کی کوششیں، حدیث کی سند اور متن میں وضع حدیث کی علامات وغیرہ کا بیان ہے۔

* **سائز:** 20X30/8 * **صفحات:** 370 * **قیمت:** 600.00


Contact No. : 7290092401, 7290092405 7290092403

**MMI PUBLISHERS** مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز

**D-307, Dawat Nagar, Abul Fazl Enclave, Jamia Nagar, New Delhi-110025**

**Email:** info@mmipublishers.net | mmipublishers@gmail.com | **Web:** www.mmipublishers.net

Sub Depot | **Hyderabad :** 9966710339, 9491874087, 04066710339, 8520961476 | **Mumbai :** 9699167700
**Goa :** 9987196549 | **Bangalore :** 9036996740, 8884045708, 9964355678

R.No. 38933/81
April-June-2023

Quarterly
Tahqeeqat-e-Islami
Aligarh

Mob. +91-9027445919
+91-9897746586

New Arrival

عصر حاضر میں
اسلام کو درپیش چیلنجز

(فکر انگیز مقالات کا مجموعہ)

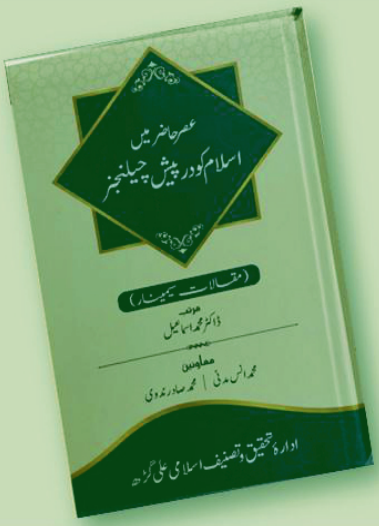


چند جھلکیاں:

- سیاسی وسماجی مسائل
- مسلم اقلیتیں
- خواتین کے سماجی حقوق
- رجوع الی القرآن

Scan to
Place Your Order

صفحات: 360 | قیمت: 350

ناشر: ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی، نبی نگر، پوسٹ بکس نمبر 93، علی گڑھ، یوپی، 202002
میل: idaratahqeeq2016@gmail.com

Contact: 9027445919

ملنے کے پتے:

۱- ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی، نبی نگر، پوسٹ بکس نمبر: ۹۳، علی گڑھ۔ ۲
۲- مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، ڈی-۳۰۷، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی۔ ۲۵